ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

آدھی رات کا سورج

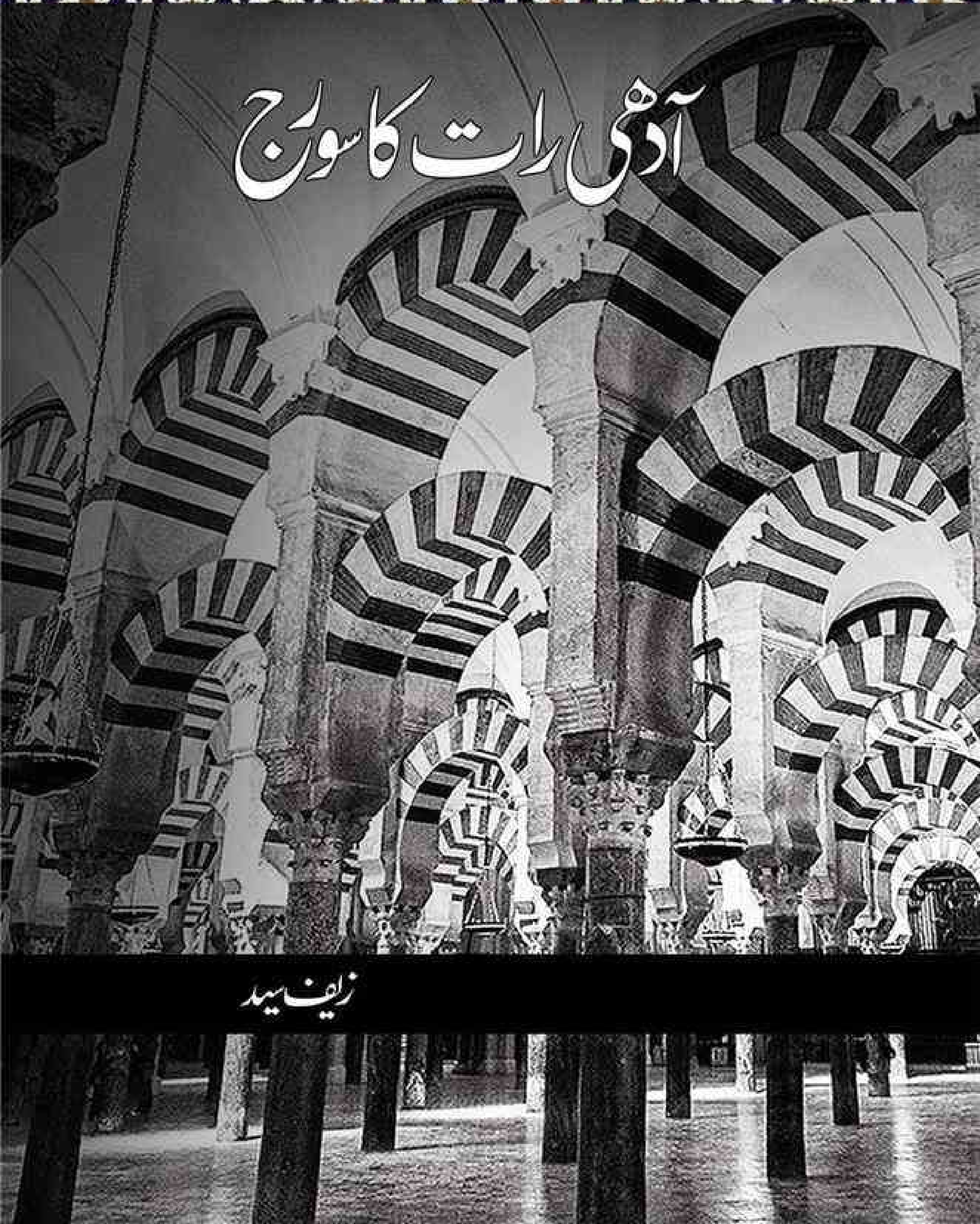

زائف سید

ساقیِ اربابِ ذوق

PDF BOOK COMPANY

مدد، مشاورت، تجاویز اور شکایات :

Muhammad Husnain Siyalvi
0305-6406067
Sidrah Tahir
0334-0120123
Muhammad Saqib Riyaz
0344-7227224

کتاب کی کمپوزنگ طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی جاتی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی یا صفحہ درست نہ ہوں تو از راہِ کرم مطلع فرمائیں۔ تاکہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائے (ناشر)

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	:	آدھی رات کا سورج
		(سپین میں مسلمانوں کا عروج وزوال اور اس کے یورپی تہذیب پر اثرات)
مصنف	:	زیف سید
اہتمام	:	ظہور احمد خاں
پبلشرز	:	فکشن ہاؤس لاہور
کمپوزنگ	:	فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور
پرنٹرز	:	سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور
سرورق	:	ریاض ظہور
اشاعت	:	2013ء
قیمت	:	-/250 روپے

تقسیم کنندہ:

فکشن ہاؤس: بک سٹریٹ 39- مزنگ روڈ لاہور، فون: 042-37249218-37237430

فکشن ہاؤس: 52,53 رابعہ سکوائر حیدر چوک حیدر آباد، فون: 022-2780608

فکشن ہاؤس: نوشین سنٹر، فرسٹ فلور دوکان نمبر 5 اردو بازار کراچی، فون: 021-32603056

فکشن ہاؤس

● لاہور ● حیدر آباد ● کراچی

e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

فہرست

☆ حرفِ اول

شہیدوں کی شاہراہ

خودکش شہید

مہم جو شہزادی

عشق سے تیرا وجود

طوطیِ ہزار داستاں

لذتِ پرواز

اندلس کا تاج محل

کیسی بلندی کیسی پستی

آہ الحمرا

پانچ صدیوں بعد اذان

شہر جو خود ترجمہ بن گیا

ابنِ رشد پیرس میں

وہ جو تاریک راہوں میں مارے گئے

انتساب

شہیدوں کی شاہراہ

نیچے پہاڑی کے دونوں جانب پھیلے میدان میں تاحدِ نگاہ سیاہ خیمے نصب ہیں، جن کے آگے وسیع سبزہ زار میں گھڑسوار ہاتھوں میں بھالے تھامے ترتیب سے کھڑے ہیں۔

شہسواروں کی قطاروں میں سے ایک درمیانی عمر کا شخص اپنے سیاہ شامی گھوڑے کو ایڑ لگا کر لشکر کے بائیں طرف لے گیا۔ اس کا تمام بدن زنجیر دار زرہ بکتر میں ملفوف ہے اور سر پر آہنی خود ہے جس نے چہرے کے ایک حصے کو بھی ڈھانپ رکھا ہے۔ آنکھیں بے حد نمایاں اور چمکیلی ہیں جن میں عزم کی سختی جھلکتی ہے۔ یہ مسلمان فوج کا سپہ سالار عبدالرحمٰن ابن عبداللہ الغافقی ہے۔

الغافقی نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا، ایک میل دور پہاڑی پر درختوں کے اندر بے حد ہل چل کا سماں ہے۔ جہاں سے چڑھائی شروع ہوتی ہے وہاں ہاتھوں میں لکڑی کی ڈھالیں سنبھالے، شانے سے شانہ، قدم سے قدم ملائے سپاہیوں کی قطاریں ایستادہ ہیں، جو دور سے کسی ہزار پا کی طرح نظر آ رہی ہیں۔ سپاہیوں کی ٹولیاں پھرتی سے اِدھر اُدھر آ جا رہی ہیں۔

الغافقی کی فوج میں 30 ہزار گرم و سرد چشیدہ سپاہی ہیں اور یہ دریا سنہ 732ء میں رومیوں کی بنائی ہوئی نیم پختہ شاہ راہ پر ٹھاٹھیں مارتا ہوا فرانس کے وسط میں واقع پوئیٹیرز شہر کے پہلو سے گزر کر پیرس سے کوئی تین ساڑھے تین سو کلومیٹر قریب پہنچ گیا تھا کہ یکا یک اس کا راستا جنگل میں کھڑی فرنجی ہزار پا نے روک دیا ہے۔

لشکر کا بیشتر سواروں پر مشتمل ہے۔ ہر سوار سر سے پیروں تک زرہ بکتر میں غرق ہے۔ عرب کمان داروں کی زرہ بکتریں باریک زنجیروں سے بنائی گئی ہیں، جو تلوار کا وار اچٹنے کے لیے بے حد کارگر ہیں۔ جری بربر سورماؤں کے ہاتھوں میں لمبے نیزے ہیں جن کی انیاں دھوپ میں چمک رہی ہیں۔ یہ دشمنوں کی صفیں پلٹنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔

ارباب ذوق 0305 6406067 PDF Book Company

دوسری طرف فرنجی فوج کا غالب حصہ پیادہ سپاہیوں پر مشتمل ہے۔ اور ویسے بھی یہ بات ہے سنہ 732ء کی۔ اس وقت 'ارض الکبیر' یعنی یورپ میں بھاری کیولری کا وجود نہیں ہے، جس کی وجہ ایک بہت سادہ اور بظاہر معمولی نظر آنے والی چیز گھوڑے کی رکاب کا فقدان ہے۔ بغیر رکاب کے گھڑ سوار میدانِ جنگ میں آسانی سے پینترا بدلنے اور دشمن پر موثر حملہ کرنے کی صلاحیت سے عاری ہوتا ہے، اس لیے یورپی گھڑ سوار فوجی اکثر گھوڑے کو میدانِ جنگ تک سفر کے لیے استعمال کرتے ہیں اور عین لڑائی کے وقت گھوڑے سے اتر کر میدان میں پیادہ فوج کے شانہ بہ شانہ دادِ شجاعت دیا کرتے ہیں*

الغافقی کے لیے فرانس نیا علاقہ نہیں ہے۔ گیارہ برس پیشتر وہ طولوس کے معرکے میں السمح ابن المالک کی کمان میں لڑ چکا ہے۔ اس لڑائی میں اموی فوج کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ خود السمح میدانِ جنگ میں آنے والے زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسا تھا، لیکن اب الغافقی اپنے سپہ سالار کا بدلہ لینے 30 ہزار سواروں پر مشتمل فوج لے کر آن پہنچا ہے۔

الغافقی کے مدِ مقابل فرنجیوں کی کمان چارلز مارٹل (چارلز ہتھوڑا) کے ہاتھ میں ہے، جس نے ہر صورت میں اپنی سرزمین کو عربوں سے بچانے کا تہیہ کیا ہوا ہے۔ لیکن جو بات الغافقی اور چارلز مارٹل دونوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں، وہ یہ ہے کہ کچھ دیر بعد چھڑنے والی جنگ کو نہ صرف عہد ساز بلکہ تاریخ ساز قرار دیا جائے گا۔ الغافقی اور مارٹل نہیں جانتے کہ اکتوبر کی اس سرد شام کے ایک ہزار برس بعد تاریخ دان ایڈورڈ گبن لکھے گا کہ اس جنگ میں فتح عربوں کو:

> 'پولینڈ کے میدانوں اور سکاٹ لینڈ کے درّوں تک لے جاتی۔ دریائے رائن نیل یا فرات سے زیادہ گہرا نہیں ہے۔ عرب بحری بیڑا بغیر لڑے ٹیمز کے دہانے پر آ کھڑا ہوتا۔ عین ممکن ہے کہ آج آکسفرڈ یونیورسٹی میں قرآن پڑھایا جا رہا ہوتا اور اس کے میناروں سے پیغمبرِ اسلام کی تعلیمات کی تقدیس بیان کی جا رہی ہوتی۔'

....

* قرونِ وسطیٰ کے یورپ کا ذکر آتے ہی ذہن میں زرہ پوش نائٹ کا خیال آتا ہے، لیکن یہ نائٹ دراصل عربوں نے یورپ میں متعارف کروایا تھا۔

آج میرا پیرس میں دوسرا اور آخری دن تھا۔ اگرچہ کل سارا دن پھر کی کی طرح گھومتا پھرتا رہا تھا اس لیے رات شدید تھکان تھی۔ اس کے باوجود منھ اندھیرے اٹھنا پڑا کیوں کہ مجھے جنوبی فرانس جانے کے لیے ٹرین پکڑنا تھی۔ روئل فرمنٹین ہوٹل کی دلِ کنجوس سے بھی تنگ لفٹ سے اتر کر جب میں استقبالیے پر پہنچا تو میرے نام استقبالیہ خاتون کا تحریری پیغام موجود تھا۔ بے حد ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اطلاع دی گئی تھی کہ میں اپنا سوٹ کیس ہوٹل ہی میں چھوڑ کر جا سکتا ہوں اور یہ کہ واپسی پر میرے لیے اسی ہوٹل میں بکنگ ہو چکی ہے۔

چوں کہ ناشتہ ہوٹل کے کرائے ہی میں شامل تھا، اس لیے کرنا ضروری تھا، لیکن مالٹے کے کھٹے جوس، چند لمبوتری فرانسیسی ڈبل روٹیوں اور کسیلی کافی کے سوا میز پر کچھ نہیں تھا۔ سفید ایپرن باندھے ہوئے شفیق باورچن نے مجھے ناشتے کی خوبیوں پر شستہ فرانسیسی میں لیکچر دیا لیکن ظاہر ہے کہ اپنے پلے کوئی بات نہیں پڑی۔

جب میں ٹیکسی لے کر مونت پارنیس ٹرین سٹیشن کے لیے روانہ ہوا تو پیرس انگڑائیاں لیتے اور آنکھیں ملتے آہستہ آہستہ بیدار ہو رہا تھا۔ سٹیشن پر چمچماتی ٹی وی جی ٹرین جنوبی فرانس کے شہر بوردو جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ بیشتر ٹرین خالی پڑی تھی۔ اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آیا عام طور پر اس روٹ پر زیادہ مسافر سفر نہیں کرتے یا اتفاق سے وہ ہفتے کا کوئی ایسا دن تھا جب زیادہ بھیڑ بھاڑ نہیں ہوتی۔ میں نے اپنے لیے ایک سیٹ کا انتخاب کیا۔ چند ہی لمحوں بعد ٹرین چل دی۔

ٹی وی جی بلٹ ٹرین ہے اور اس کی زیادہ سے زیادہ رفتار تین سو کلومیٹر فی گھنٹا ہے، اس لیے یہ پلک جھپکتے ہی پیرس کی حدوں سے نکل گئی۔ میرے سامنے ایک بظاہر مفلوک الحال سا خاندان بیٹھا ہوا تھا، تین بچے، ایک درمیانی عمر کی خاتون اور ایک بڑی عمر کی محترمہ۔ انداز سے وہ مجھے جپسی معلوم ہوئے۔ جپسیوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ ایک ہزار سال قبل پنجاب کے میدانوں سے ہجرت کر کے یورپ میں جا آباد ہوئے تھے، اور ان کی زبان میں اب بھی پنجابی اور سرائیکی کی باقیات ملتی ہیں۔ میں نے اس لالچ میں ان کی گفتگو غور سے سننے کی کوشش کی کہ شاید کوئی شناسا لفظ کان میں پڑ جائے لیکن اس مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔

پوئیتیرز بہت پرانا شہر ہے۔ اس کی بنیاد رومی سلطنت کے آغاز سے بھی پہلے پڑ چکی تھی۔ رومی دور میں بڑی شاہراہ کے قریب ہونے کی وجہ سے شہر کو مرکزی اہمیت حاصل تھی۔ اس زمانے

کی کئی یادگاریں شہر میں موجود ہیں۔ شہر کی گلیاں تنگ اور اونچے نیچے پتھر کی بنی ہوئی ہیں۔ گلیوں میں سیاحوں کی سہولت کے لیے نیلی، پیلی اور سرخ رنگ کی راہ نما پٹیاں بنائی گئی ہیں جن پر چلتے ہوئے آپ شہر کی اہم عمارتیں اور دل چسپی کے دوسرے مقامات با آسانی دیکھ سکتے ہیں۔

غالباً پوئیتیرز کی سب سے اہم تاریخی عمارت نوٹرے ڈیم کا کیتھیڈرل ہے۔ اس کا زیادہ مشہور ہم نام بھائی پیرس میں ہے، لیکن گاتھک انداز میں بنایا گیا ہلکے بھورے رنگ کا یہ کلیسا بھی بہت رعب دار اور پر تمکنت ہے۔ اسے بارھویں صدی میں تعمیر کیا گیا تھا۔ مجھے کلیسا کی بیرونی دیواروں اور مخروطی محرابوں کے اردگرد بنائے گئے ابھرواں سنگ تراشی کے نمونوں نے بے حد متاثر کیا، جن میں عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے لے کر آخری عشائیے تک کی داستان تصویری شکل میں پیش کی گئی ہے۔ ان مجسموں کو دیکھ کر مجھے بچپن میں جنگ اخبار میں شائع ہونے والی ٹارزن کی تصویری کہانیاں یاد آ گئیں جن کے خالق ہر ہفتے کہانی کو اس قدر ہوش ربا موڑ پر چھوڑ دیتے تھے کہ اگلی قسط کے انتظار میں ہفتہ کاٹنا دوبھر ہو جاتا تھا۔

لیکن میں نے اتنا کشٹ پوئیتیرز کا کلیسا دیکھنے کے لیے نہیں اٹھایا تھا، اس لیے ہوٹل میں سامان رکھ، ہاتھ منھ دھو اور کپڑے بدل کر باہر نکل آیا۔ اسی اثنا میں ہوٹل کے عملے نے فون کر کے ٹیکسی منگوالی تھی۔ چھوٹی سی رینو ٹیکسی میں سیاہ فام ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ کر میں شہر کے شمال مشرق کی طرف روانہ ہو گیا۔ میری منزل بیس کلومیٹر دور ایک جگہ تھی۔ راستے میں ایک بے حد دل کش نیلگوں جھیل نظر آئی لیکن میں کوشش کے باوجود اس کا نام نہیں دیکھ سکا۔

آدھے گھنٹے کے بعد ٹیکسی ایک چھوٹی سی پہاڑی پر بنی ہوئی ایک عمارت کے سامنے کھڑی تھی، جس کے بائیں طرف ایک چھوٹی ندی بہتی ہے جو کئی جگہوں پر چھوٹی چھوٹی جھیلوں میں منقلب ہو جاتی ہے، جب کہ دائیں طرف اونچی نیچی زمین پر ہرے بھرے کھیتوں کے بعد ایک چھوٹی سی بستی ہے جس کے ساتھ ساتھ ایک دریا کی جھلک بھی نظر آ رہی ہے۔

یہ وہ مقام ہے جسے فرانسیسی اپنی زبان میں موسائی بتائل Moussais la Bataille اور عربی میں بلاط الشہدا کہتے ہیں۔

میں ٹیکسی سے اتر آیا۔ مئی کا مہینا ہے، لیکن پھر بھی ہلکی سی خنکی کا احساس ہو رہا ہے۔ آسمان کسی بچے کی آبی رنگوں سے بنائی ہوئی تصویر کے مانند ضرورت سے زیادہ نیلا ہے۔ تھوڑی تھوڑی

دیر کے بعد دور سڑک سے کسی گاڑی کی آواز آنے کے باوجود فضا گمبھیر سکوت کی تہوں میں لپٹی ہوئی ہے۔ میں گہری سانس لے کر کچھ سننے کی کوشش کرتا ہوں۔

تھوڑا آگے بڑھ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ سیاحوں کی سہولت کے لیے فرانسیسی حکومت نے معلوماتی بورڈ نصب کر رکھے ہیں۔ یہیں زمین پر شطرنج کی طرز کے خانے بنے ہیں جن کے اندر تیرہ سو برس قبل ہونے والے کارزار کی باتصویر تفصیلات کے علاوہ اسلام اور اسلام کی تاریخ کے بارے میں بھی معلومات درج کی گئی ہیں۔ بساط کے بیچوں بیچ ایک جھنڈا نصب کیا گیا ہے جس پر ۷۳۲ء کے ہندسے درج ہیں۔ معلوم نہیں اس جگہ کے بنانے والوں کو یہ معلوم تھا کہ نہیں کہ شطرنج ہندوستانیوں کی ایجاد سہی لیکن اسے عربوں ہی نے یورپ میں متعارف کروایا تھا۔

خاموشی، بے کراں خاموشی۔ لیکن کچھ دیر کے بعد مجھے مدھم مدھم سی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ غور سے سننے کی کوشش کرتا ہوں تو آوازیں کچھ کچھ واضح ہونا شروع ہوتی ہیں، جیسے ریڈیو کی سوئی گھمانے سے رفتہ رفتہ مطلوبہ سٹیشن کی نشریات صاف ہو جاتی ہیں۔ گھوڑوں کی ہنہناہٹیں، آپس میں ٹکراتی ہوئی تلواروں، نیزوں اور بھالوں کی کھنک، تیروں کی سنسناہٹ، یلغار کرتے ہوئے دستوں کے پرجوش نعرے، زخمیوں کی فریادیں۔ رفتہ رفتہ پہاڑی پر بنی عمارتیں تحلیل ہو جاتی ہیں، دامن میں لپٹی ہوئی سڑک غائب ہو جاتی ہے، دائیں ہاتھ پر بنا گاؤں روپوش ہو جاتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس جگہ گھنا جنگل اُگ آتا ہے۔

اور مئی کی اس چمکتی سہ پہر سے 1276ء برس قبل اسی جگہ تقریباً اسی وقت صدیوں پرانی شاہ راہِ روم پر سیلِ بلا کی مانند بڑھتی ہوئی زبردست فوج ظفر موج کو دیکھ کر الغافقی کی چھاتی فخر سے چوڑی ہو گئی۔ اس نے دل میں سوچا، کون ہے جو اس طوفانِ بلاخیز کے سامنے میدان میں ٹھہر سکے؟

....

طورس کا سونے چاندی سے مالا مال شہر صرف پچاس میل کے فاصلے پر ہے جب کہ پیرس بھی زیادہ دور نہیں ہے کہ الغافقی کے جاسوسوں نے اسے رومی شاہ راہ کے بائیں طرف پہاڑی پر واقع جنگل میں فرانسیسی فوج کے اجتماع کی اطلاع دی۔

عبدالرحمٰن الغافقی یمن میں پیدا ہوا تھا۔ سپہ گری گھٹی میں پڑی تھی۔ اس نے ذاتی لیاقت اور فنونِ حرب میں مہارت کی بنا پر منزلوں پر منزلیں مارتے ہوئے اموی اربابِ اختیار کی نظروں میں

اہم مقام حاصل کرلیا تھا۔ جب 712ء میں شمالی افریقہ کے گورنر موسیٰ بن نصیر نے طارق بن زیاد کی اندلس پر چڑھائی کے ایک برس بعد خود ایک بڑی فوج لے کر وہاں کا رخ کیا تو عبدالرحمٰن اس فوج کا حصہ تھا۔ جب 721ء میں طولوس کے باہر سپہ سالار السمح شدید زخمی ہو گیا تو اس نے عبدالرحمٰن ہی کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ چوں کہ اموی خلفا کے دستور کے مطابق فوج کا سپہ سالار ہی علاقے کا امیر ہوتا تھا، اس لیے عبدالرحمٰن جب بچی کھچی فوج لے کر قرطبہ لوٹا تو وہ اندلس کا امیر بن گیا۔

تاہم اس زمانے میں اندلس شمالی افریقہ کے گورنر کے ماتحت تھا جو عبدالرحمٰن کو پسند نہیں کرتا تھا، اس لیے اس نے اس عہدے پر ابن سہیم الکلبی کو تعینات کر کے عبدالرحمٰن کو جنوب مغربی فرانس کے علاقے ناربون کا امیر مقرر کر دیا جو اس وقت اندلس کا سرحدی صوبہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ گورنر کو عبدالرحمٰن کی یہ عادت پسند نہیں تھی کہ وہ میدانِ جنگ میں دشمن کے زخمی سپاہیوں کے لیے نرم گوشہ رکھتا تھا۔ عبدالرحمٰن کو ایک شرف یہ بھی حاصل تھا کہ وہ خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق کے صاحب زادے سے بے حد قریب تھا۔ اس کے علاوہ وہ پرہیزگاری اور ایمان داری کے ساتھ ساتھ شجاعت اور جنگی سوجھ بوجھ کی وجہ سے ہر دل عزیز تھا۔

دو برس قبل خود اموی خلیفہ ہشام ابن عبدالملک نے الغافقی کو اندلس کا امیر مقرر کیا تھا۔ اسے وہ کام پورا کرنا تھا جو السمح نے ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ الغافقی نے اس مہم کے لیے خاص طور پر اپنے آبائی وطن یمن سے وفادار کمان دار منگوائے تھے، جن کی بہادری اور جنگی لیاقت پر اسے کامل بھروسا تھا۔

عبدالرحمٰن الغافقی نے اپنی فوج کو فرانسیسی فوج کے بالمقابل پہاڑی کے دامن میں صف بندی کا حکم دے دیا۔ اس نے دیکھا کہ فرانسیسی پیادہ درختوں کے قریب سینے سے لے کر گھٹنوں تک آتی ہوئی بھاری چوبی ڈھالیں اٹھائے، قدیم رومی انداز میں مربع جنگی تشکیل بنا کر کلہاڑیاں اور تلواریں سونتے، صفیں باندھے، تیار کھڑے ہیں۔ اگرچہ گھنے درختوں کی وجہ سے دشمن کی صحیح تعداد کا اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا، لیکن الغافقی پھر بھی زیادہ فکر مند نہیں تھا۔ بھلا گھڑسوار اور پیادے کا کیا مقابلہ؟ الغافقی کے نیزہ بردار برق رفتار گھڑسوار پل بھر میں پیادہ فوجوں کی صفیں الٹنے کے فن میں طاق تھے۔

فرانسیسی جرنیل چارلز مارٹل کو شاید آکسفرڈ یونیورسٹی کے میناروں کی اتنی فکر نہ ہو لیکن وہ یہ بات یقیناً جانتا تھا کہ اس مسلم فوج کا راستا روکنا بہت ضروری ہے۔ اس نے سن رکھا تھا کہ 21 برس پیشتر طارق بن زیاد کی فوج نے صرف ایک برس کے اندر اندر پونے پانچ لاکھ مربع کلومیٹر پر محیط جزیرہ نما آئبیریا کو منہ زور سیلاب کی طرح روند دیا تھا۔ سوائے راڈرک کے ساتھ ایک معرکے کے بقیہ جزیرہ نما نے بغیر لڑے مسلمانوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے تھے۔ اسے جزئیات تو معلوم نہیں ہوں گی لیکن اس نے جہاں گشت پادریوں اور تاجروں کی زبانی سنا ضرور ہو گا کہ مسلمانوں نے تاریخ کے پلک جھپکتے ہی سنکیانگ کے پہاڑوں اور پنجاب کے دریاؤں سے لے کر مغرب میں بحرِ اوقیانوس کے ساحلوں تک جھنڈے گاڑ دیے تھے۔

اس زمانے کا فرانس اکائی نہیں تھا بلکہ فقیر کی گدڑی کی طرح چھوٹی چھوٹی اکثر باہم متحارب ریاستوں میں بٹا ہوا تھا جن کا سلسلہ ہسپانیہ کی سرحد سے لے کر انگلش چینل تک چلا گیا تھا۔ ان ریاستوں کے سردار پل بھر میں وفاداریاں، ہمدردیاں اور دشمنیاں تبدیل کرتے رہتے تھے۔

مارٹل اور اس کی فوج مسلسل بیس سال سے فرانس اور شمالی سپین کے راج واڑوں کے ساتھ حالتِ جنگ میں تھے۔ مارٹل نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پی رکھا تھا۔ اسے اچھی طرح سے علم تھا کہ کھلے میدان میں عرب فوج کا مقابلہ کرنا خودکشی کے مترادف ہے، اسی لیے اس نے رومی شاہراہ سے گریز کرتے ہوئے اپنی فوجیں اس پہاڑی پر پھیلے جنگل پر مرکوز کر لی تھیں۔ یہاں اس کی فوج اونچائی پر تھی، چناں چہ مسلمان گھڑسوار یلغار نہیں کر سکتے تھے۔ مزید یہ کہ اس نے اپنے دستے جنگل کے اندر پھیلا رکھے تھے، جس سے ایک تو اس کی فوج کی تعداد کا درست اندازہ لگانا مشکل تھا، دوسرے درختوں کے اندر گھوڑے اتنے ہی مؤثر تھے جتنی مچھلی خشکی پر ہوتی ہے۔

ادھر الغافقی نے بھی ہتھوڑے کی حکمتِ عملی بھانپ لی تھی، اس لیے اس نے جنگ کے پہلے چار دن تک معمولی جھڑپوں ہی پر اکتفا کی۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ سردیوں کا موسم تیزی سے بڑھا چلا آ رہا تھا، ادھر خوراک کے ذخیرے بھی توے پر رکھے مکھن کے پیڑے کی طرح تیزی سے ختم ہو رہے تھے، ساتھ ہی ساتھ رمضان کی آمد آمد تھی۔ الغافقی اپنے دارالحکومت قرطبہ سے ایک ہزار میل دور تھا، اس لیے اس جنگ کو لامتناہی طول دینا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔

چوتھے روز 25 اکتوبر کو الغافقی نے بھرپور حملہ کرنے کی ٹھان لی۔ صبح پو پھٹتے ہی اس نے

صفوں کو ترتیب دینے کا حکم صادر کر دیا۔ میمنہ نے دائیں طرف سے پیش قدمی شروع کی اور میسرہ نے بائیں جانب سے۔ قلب طرفین سے تھوڑا پیچھے رہا۔ یہ عربوں کی مشہور و معروف ہلالی تشکیل تھی، جس کے ذریعے انھوں نے ماضی میں غنیم کے بھاری لشکروں کو درمیان میں گھیر کر درانتی کی طرح کاٹ ڈالا تھا۔

ان ہراول دستوں کے پیچھے پیادہ فوج بھی حرکت میں آ گئی۔ یہ سپر انداز دستے مقدمہ کہلاتے تھے۔ ان کے عقب میں مقاتلہ تھا۔ لوہے کے بھاری خود پہنے اور زنجیر دار زرہوں میں ملبوس ان دستوں کا کام یہ تھا کہ جب گھڑسوار دشمن کی صفیں توڑ دیں تو یہ جا کر بچی کھچی پیادہ سپاہ کو درہم برہم کر دیں۔

تھوڑی ہی دیر میں ایسا تاریخ ساز معرکہ بپا ہونے والا تھا جس پر دنیا بھر کے مستقبل کا انحصار تھا۔

....

پوئیتیرز کے اس تاریخی میدانِ کارزار سے چند میل دور حکومتِ فرانس نے امریکہ کے ڈزنی ورلڈ کی طرز پر ایک 'فیوچروسکوپ' یا مستقبل نما بنایا ہے۔ اس کے اندر کسی قسم کی جدتیں رکھی گئی ہیں، جن میں تھری ڈی سینما سب سے زیادہ مقبول ہے۔ ایک قسم کی تھری ڈی فلم میں زمین پر لاکھوں برس بعد رونما ہونے والی حیاتیاتی اور جغرافیائی تبدیلیوں کی بے حد دلچسپ انداز میں عکاسی کی گئی ہے۔ دیکھنے والے کو ایسا لگتا ہے جیسے وہ اس فرضی ماحول کے اندر پہنچ گیا ہے۔

اسی مستقبل نما کے اندر میں نے سوچا کہ اگر یہاں کوئی ماضی نما بھی ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا کہ انسان کم از کم اس علاقے میں پیش آنے والے اہم واقعات کو دیکھ لیتا۔ تاہم کتابیں اسی قسم کے ماضی بین آلے کا کام سرانجام دیتی ہیں جن کی مدد سے ہم تیرہ صدیوں کی گرد کی موٹی تہہ صاف کر کے کچھ دھندلی دھندلی تصویریں اخذ کر کے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ 25 اکتوبر 732ء کو یکم رمضان کے دن وہاں کیا معرکہ پیش آیا ہوگا۔

....

مسلمان فوج نے بھرپور حملہ شروع کر دیا، لیکن مارٹل کے دودھاری کلہاڑی بردار فوجی اپنی مربع رومی ترتیب میں ڈھال سے ڈھال ملائے میدان میں ڈٹے رہے۔ جوں ہی گھڑسوار یلغار

کر کے صفیں توڑنے کی کوشش کرتے، فرانسیسی دوبارہ اپنی ترتیب برقرار کر لیتے۔ 754ء میں قرطبہ میں ایک عیسائی پادری کی لکھی ہوئی کتاب کے مطابق 'فرانسیسی سپاہ برف کی سلوں کی مانند ایستادہ رہیں جو کسی طرح پگھلنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔'

632ء میں پیغمبرِ اسلام کے وصال کے ٹھیک ایک سو برس کے اندر اندر مسلمان دنیا کی سب سے بڑی سپر پاور بن چکے تھے۔ اموی خلافت دنیا کی تاریخ کی سب سے بڑی متصل سلطنت تھی۔ ہسپانیہ میں بھی قدم جمائے انھیں 21 برس گزر چکے تھے۔ اس تمام عرصے میں ہونے والی فتوحات میں مسلمان فوج کی تعداد حیرت انگیز طور پر کم ہوا کرتی تھی۔ فوج کا بیشتر حصہ شہ سواروں پر مبنی ہوتا، جو برق رفتاری سے منزلیں مار کر غنیم کو ششدر کر دیا کرتا تھا۔

سوار کے مقابلے پر پیادہ سپاہی کی کچھ زیادہ حیثیت نہیں ہوتی۔ ایک تو سوار زمین سے دو ڈھائی گز بلندی سے حملہ آور ہوتا ہے، پھر اس کے نیزے یا تلوار کی کاٹ میں گھوڑے کا مومینٹم بھی شامل ہوتا ہے۔ اور اگر وار خالی بھی جائے تو وہ گھوڑے کو ایڑ لگا کر پیادے کی زد سے دور جا کر دوبارہ دھاوا بول سکتا ہے۔

لیکن مارٹل یہ ساری باتیں اچھی طرح سے جانتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ منتشر پیادہ فوج گھڑ سواروں کے مقابلے پر گاجر مولی کی طرح کٹ جائے گی۔ لیکن اگر یہی پیادہ فوجی نظم و ضبط کے ساتھ اکائی کی طرح میدان میں ڈٹ جائیں، تو بڑے سے بڑے شہ سوار لشکر کو بھی جوکھم میں ڈال سکتے ہیں۔ مارٹل کی فوج لگاتار دو عشروں سے حالتِ جنگ میں تھی۔ اس کے تجربہ کار فوجیوں نے رومیوں کی ایجاد کردہ ایک ہزار سال پرانی جنگی تشکیلات کو نئی زندگی دی تھی۔ ہر سپاہی کے پاس بھاری لکڑی کی مضبوط ڈھال تھی، جس پر تلوار، تیر یا نیزہ بے اثر تھے۔ سر پر مخروطی خود تھا جس کی ایک آہنی دھار اوپری ہونٹ تک آتی تھی، مقصد یہ تھا کہ ناک تلوار کے وار سے بچی رہے۔ لیکن اس فوج کا سب سے بڑا ہتھیار اس کا زبردست نظم و ضبط تھا۔

مارٹل کی فوج رن میں یوں ڈٹی رہی کہ عرب شہ سواروں کو اس کے اندر گھسنے کے لیے کوئی رخنہ، کوئی درز نہیں مل رہی تھی۔ مسلم گھڑ سوار بار بار یلغار کرتے، لیکن ہر بار فرنجی سپاہی انھیں یوں پسپا ہونے پر مجبور کر دیتے جیسے سمندر کی پرشور لہریں سنگلاخ ساحل سے سر پٹک کر رہ جاتی ہیں۔

ایک دو دفعہ مسلم دستے برف کی سل کو کاٹ کر مربع کے اندر بھی پہنچنے میں کامیاب ہو گئے،

لیکن مارٹل کے سپاہیوں نے ہر بار دائیں بائیں سے بڑھ کر دراڑ کو پر کر دیا اور صورتِ حال جوں کی توں رہی۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ فرنجیوں کا مثالی نظم و نسق مسلم شہ سواروں کے بے پایاں جوش و خروش کا کہاں تک مقابلہ کرتا، لیکن اس موقعے پر ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے جنگ کا نقشہ پلٹ کر رکھ دیا۔ گھمسان کے رن کے دوران موقع بھانپ کر چارلز کے حلیف ڈیوک آف یوڈز نے گھڑ سواروں کے مختصر رسالے کے ساتھ مسلمان فوج کے عقب پر دھاوا بول دیا۔ پوئیٹیرز کے آس پاس کا علاقہ یوڈز کی عمل داری میں آتا تھا اس لیے اسے مقامی جغرافیے کا بہتر علم تھا، اسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے ایسے رخ سے حملہ کیا جہاں سے مسلم فوج کی اس کی توقع نہیں تھی۔

مسلمانوں نے فرانس کے وسط تک پہنچتے پہنچتے کئی شہر فتح کیے تھے اور ان فتوحات کا مالِ غنیمت لشکر کے عقب میں جمع تھا۔ یہیں خیموں میں فوجیوں کی بیویاں اور بچے بھی تھے۔ جب برسرِ پیکار مسلم سپاہیوں کو خبر ملی کہ دشمن نے عقب پر حملہ کر دیا ہے تو ان میں سراسیمگی پھیل گئی۔ کئی دستے اپنی ترتیب توڑ کو عقب کی طرف بھاگے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ مالِ غنیمت بڑی حد تک سلامت ہے لیکن اسی افراتفری کا فائدہ اٹھا کر چارلز اور اس کے اتحادیوں نے اپنی دفاعی تشکیل چھوڑ کر پوری شدت سے دھاوا بول دیا۔

الغافقی نے دستوں کے انتشار سے پریشان ہو کر جو پلٹنے کی کوشش کی تو فرانسیسی سپاہیوں کے نرغے میں آ گیا۔ الغافقی کہنہ مشق جرنیل تھا، اور زرہ بکتر میں لپٹا ہوا تھا، لیکن بدقسمتی سے دشمن کے نیزے کے وار سے اس کا گھوڑا گر گیا، اور یوں دیکھتے ہی دیکھتے مسلم فوج کا سپہ سالار میدان میں کام آ گیا۔ اس کی ہلاکت کی خبر نے رہی سہی کسر پوری کر دی اور مسلمان فوجیوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ لیکن اسی اثنا میں رات کا اندھیرا پھیل گیا اور جنگ دوسرے دن کے لیے موقوف کر دی گئی۔

اگلی صبح چارلز مارٹل نے اٹھ کر مسلم خیموں کی طرف دیکھا تو اس کا دل ڈوبنے لگا، افق پر جہاں تک نظر جاتی تھی، مسلم سپاہیوں کے سیاہ خیمے نصب تھے۔ چارلز خوب سمجھتا تھا کہ کل کی فتح عارضی تھی اور مسلمان آج زخمی شیر کی طرح لڑیں گے۔

سورج افق سے بالشت بھر اوپر آ گیا، لیکن مسلم خیام سے کوئی حرکت تو کجا، کسی قسم کی آواز

تک نہیں آ رہی تھی۔ نہ گھوڑوں یا بار برداری کے جانوروں کی ہنہناہٹ، نہ صدائے اذاں، نہ عربی، بربر، فارسی یا قشتالی زبان میں کسی سپاہی کے بولنے کی آواز۔ کچھ بھی نہیں۔ چارلز مارٹل کا ماتھا ٹھنکا۔ یقیناً یہ کوئی چال ہے۔ جوں ہی اس کی فوج ڈھلوان اور جنگل کی پناہ چھوڑے گی، عرب فوج اس پر ٹوٹ پڑے گی۔ اس نے چند جاسوس بھجوا کر جائزہ لینا چاہا۔ کیا خبر مسلم فوج دریا کے دوسرے کنارے پر درختوں کی آڑ میں گھات لگائے بیٹھی ہو۔ جاسوسوں نے دور دور کا علاقہ چھان مارا، اونچے درختوں اور ٹیلوں پر چڑھ کر دیکھ لیا۔

مسلم فوج رات کی تاریکی میں اپنا مالِ غنیمت اٹھا کر پسپائی اختیار کر چکی تھی۔ برف کی سلوں نے عرب کشور کشائی کے شعلوں کو بجھا دیا تھا۔

چارلز کا خدشہ درست تھا، یہ واقعی شاطرانہ چال تھی، جو بے حد کارگر ثابت ہوئی۔ چال یہ تھی کہ کھڑے خیمے دیکھ کر عیسائی فوج انتظار کرے گی اور اموی فوج کو آسانی سے دور نکلنے کا موقع مل جائے گا۔

....

تاریخ دان بھی ایک قسم کا نجومی ہوتا ہے، فرق صرف یہ کہ وہ مستقبل کی بجائے ماضی کے بارے میں پیش گوئیاں کرتا ہے۔ ایسے ہی چند تاریخ دانوں نے الغافقی کی کئی مہلک غلطیوں کی نشان دہی کی ہے۔ ایک تو یہ کہ اس نے دشمن کی طاقت کا اندازہ لگانے یا اس کی نقل و حرکت کا سراغ لگانے کی زحمت نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ چارلز مارٹل اپنی مرضی کا میدانِ جنگ منتخب کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اور تو اور، الغافقی کو اپنے مدِ مقابل عیسائی سپاہ سالار کا نام تک معلوم نہیں تھا۔

ایک اور بڑی غلطی اس نے یہ کی کہ اپنی فوجی برتری کے زعم میں اس نے آزمودہ روایت کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنا نائب مقرر نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے قتل کی رات جب مسلم سرداروں کا اجلاس ہوا تو اس میں عربوں، شامیوں، بربروں اور اندلسیوں میں نئے سپہ سالار کے انتخاب کے مسئلے پر اختلاف اس قدر شدید ہوگیا کہ خود مسلم فوج کے مختلف دھڑوں میں تلوار سونتنے کی نوبت آتے آتے بچی۔ چناں چہ ایسے حالات میں انھوں نے یہی مناسب سمجھا کہ اب تک جو مالِ غنیمت مل چکا ہے، اسی اکتفا کرتے ہوئے واپسی کا راستا اختیار کر لیا جائے۔

جدید و قدیم تاریخ دانوں کی اکثریت اس پسپائی کو تاریخ کا عظیم فیصلہ کن لمحہ سمجھتی ہے۔

مسلمان مورخ اسے معرکہ بلاط الشہدا کہتے ہیں۔ بلاط کا مطلب ہے پختہ فرش اور اس سے مراد وہ رومی شاہراہ ہے جس پر یہ جنگ لڑی گئی۔ اس شاہراہ پر کتنے مسلمان فوجیوں کا خون بہا، اس کے بارے میں وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ تاہم جدید مؤرخین کا خیال ہے کہ اس جنگ میں ان کی ایک تہائی تعداد میدان میں کھیت رہی۔

مغربی مفکروں میں گبن کا اقتباس آپ اوپر پڑھ چکے ہیں۔ بلجیم کے مورخ گوڈرفروئڈ کرتھ (Goderfroid Kurth) کا خیال ہے کہ اس جنگ کو لازماً تاریخ ساز واقعات میں سے ایک قرار دینا ہوگا، یہ وہ جنگ تھی جس پر اس بات کا انحصار تھا کہ آیا یورپ عیسائی رہے یا اسلام تمام براعظم میں سرایت کر جائے۔ جرمن فوجی مورخ ہانز ڈیلبر وک (DelbruckHans) کہتے ہیں کہ تمام دنیا کی تاریخ میں اس سے زیادہ اہم جنگ نہیں لڑی گئی۔ اور تو اور ہٹلر تک نے خیال آرائی کی ہے کہ اگر مارٹل کو شکست ہو جاتی تو یورپ کا مذہب اسلام ہوتا۔

اس جنگ کے بعد چارلز مارٹل کو موقع مل گیا کہ وہ ایک طاقت ور فرانسیسی سلطنت کی بنیاد رکھ سکے۔ یہی سلطنت مارٹل کے پوتے شارلمین کو ورثے ملی جسے اس نے جلا بخش کر یورپ کی شان دار ترین سلطنتوں میں سے ایک بنا ڈالا۔

تاہم اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ تمام مغربی دانش ور اس جنگ کے مدح سرا ہیں۔ مذہب اور قومیت کی جذباتی حدیں پھلانگ کر بعض محققین نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اگر اس دن عبدالرحمٰن الغافقی کی فوجیں مارٹل کی شطرنجی چالوں پر قابو پانے میں کامیاب ہو جاتیں تو تمام کا تمام مغرب صحیح معنوں میں عالم گیر ثقافت کا حصہ بن جاتا۔ ایسا مغرب جو کم ازکم پانچ صدیوں بعد تک گھٹا ٹوپ اندھیرے میں غرق رہا، بہت پہلے علم و دانش کی کرنوں سے منور ہو جاتا۔

موجود دور کے مشہور تاریخ دان ڈیوڈ لیورنگ لیوس نے اپنی کتاب 'گاڈز کروسیبل' (خداوندی کٹھالی) میں بڑے تاسف سے لکھا ہے، 'فرانس میں مسلمانوں کی شکست معاشی طور پر پسماندہ، ایک دوسرے سے گتھم گتھا، اور برادر کش یورپ کی تخلیق کا باعث بنی۔۔۔ ایسا یورپ جس کی نمایاں خصوصیات موروثی جاگیرداری، مذہبی عدم رواداری، تفرقہ پرستی، اور مسلسل جنگ تھیں۔' وہ مزید لکھتے ہیں 'سلطنتِ رومہ کے زوال کے بعد یہ انسانی تاریخ کا عظیم ترین زیاں ہے۔'

فرانسیسی محققین Henri Jean Roy اور Jean Deviosse نے مسلم فتح سے یورپ کو پہنچنے والے ممکنہ ثمرات کا تخمینہ پیش کیا ہے: فلکیات، ٹرگنومیٹری، عربی ہندسے، یونانی فلسفہ۔ان دونوں ماہرین نے حساب لگایا ہے کہ اگر اس دن عرب بالا دست رہتے تو آج یورپ 267 برس زیادہ ترقی یافتہ ہوتا۔

ظاہر ہے کہ یورپ میں یہ ساری چیزیں پہنچیں ضرور لیکن تھوڑی تاخیر سے۔اور ان کی ترسیل براستہ اندلس ہوئی، جو میری اگلی منزل تھا۔

خودکش شہید

گیارہ مارچ 2004

میڈرڈ کے نواحی علاقے میں الکالا دی ہینا ریز ریلوے سٹیشن کے قریب صبح کے وقت ایک سفید رنگ کی رینو وین آ کر رکی۔ اگر چہ وسطی سپین میں سردیوں کا موسم ختم ہو چکا تھا، لیکن اس کے باوجود وین سے اترنے والے تینوں آدمیوں نے بھاری جیکٹیں پہن رکھی تھیں اور ان کے چہرے دبیز مفلروں میں چھپے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک آدمی نے سفید رنگ کا رومال اس انداز سے لپیٹا ہوا تھا جیسا عام طور پر میڈرڈ کی مشہور فٹ بال ٹیم ریال میڈرڈ کے مداح میچ کے دوران سٹیڈیم میں لپیٹا کرتے ہیں۔

تینوں مرد تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے ریلوے سٹیشن میں داخل ہو گئے۔ ان کے کندھوں پر بھاری سفری بیگ لدے ہوئے تھے۔ پلیٹ فارم پر اتوچا سٹیشن جانے والی ٹرین کھڑی تھی، جس کا نمبر 21431 تھا۔ دفتروں میں کام کرنے والے بابو، میڈرڈ کے وسیع تعمیراتی منصوبوں میں کام کرنے والے مزدور، دوسرے ملکوں سے آئے ہوئے سیاح، حاملہ عورتیں، نوجوان جوڑے، سکولوں کالجوں کو جانے والے طلبا اور دوسرے شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد اس ٹرین کے وسیلے سے میڈرڈ کے وسطی علاقوں کے لیے عازمِ سفر تھے۔

پلیٹ فارم پر پہنچ کر تینوں مختلف ڈبوں میں سوار ہوئے۔ ریال میڈرڈ کے مداح نظر آنے والے شخص نے ایک کھچا کھچ بھرے ہوئے ڈبے کا رخ کیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ اس ڈبے سے اتر کر اسی پلیٹ فارم پر مخالف سمت میں کھڑی ایک اور ٹرین میں سوار ہو گیا۔ اسی دوران اس کے ساتھی بھی ٹرینیں بدل چکے تھے۔ پلیٹ فارم پر اتوچا جانے والی ٹرین کی روانگی کا اعلان گونجنے لگا۔ تینوں ساتھی ایک بار پھر ڈبوں سے اتر آئے اور سٹیشن کی سیڑھیاں چڑھ کر ایک اور ٹرین کے پچھلے

ڈبوں میں داخل ہو گئے۔

....

میڈرڈ جانے والا جہاز چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ ہوا یوں کہ پیرس کے چارلز ڈیگال ایرپورٹ پر جب میں گیٹ نمبر 25 کے آگے بیٹھا میڈرڈ کی پرواز کا انتظار کر رہا تھا تو کسی وجہ سے انتظامیہ نے گیٹ بدل دیا۔ ظاہر ہے کہ فرانسیسی زبان میں اس امر کی اطلاع کئی بار دی گئی ہوگی۔ آخر جب پرواز میں چند منٹ رہ گئے تو مجھے لاؤڈ سپیکر پر طویل فرانسیسی اعلان کے درمیان اپنا نام سنائی دیا۔ میں بھاگم بھاگ کاؤنٹر پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ میری پرواز کا گیٹ اب 29 ہو گیا ہے اور جہاز فقط میری ہی راہ تک رہا ہے۔

جب جہاز میڈرڈ کے براہاس ہوائی اڈے پر اترا تو پورا شہر بادلوں کی بھیگی پرتوں میں لپٹا ہوا تھا۔ فرانس اور سپین دونوں یورپی یونین کا حصہ ہونے کی وجہ سے گویا ایک ہی ملک ہیں، اس لیے کسٹم اور امیگریشن کے مراحل سے نہیں گزرنا پڑا۔ براہاس اگرچہ یورپ کے مصروف ترین ہوائی اڈوں میں سے ایک ہے، لیکن مجھے یہ امریکی ہوائی اڈوں کی نسبت بہت سادہ اور کم پرتکلف لگا۔ ایک ہی لمبی قطار میں کاؤنٹر لگے ہوئے ہیں، جہاں مختلف رنگ ونسل کے افراد اپنے اپنے سامان کی ٹرالیاں ٹھیلتے ہوئے ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ زیرِ زمین ریل کا اڈا ایرپورٹ کے دوسرے سرے پر تھا، جہاں تک پہنچتے پہنچتے بیس منٹ لگ گئے۔ لیکن وہاں یہ مسئلہ آڑے آ گیا کہ ریل کا ٹکٹ کیسے خریدا جائے۔ ایک تو کرائے کا اندازہ نہیں، دوسرے ٹکٹ مشین پر ہدایات صرف ہسپانوی زبان میں درج ہیں۔ خیر ایک نوجوان سے بات کی تو اس نے کہا کہ دو یورو لگیں گے اور مجھ سے رقم لے کر گلابی رنگ کا چھوٹا سا ٹکٹ مشین سے نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دیا اور ساتھ ہی میڈرڈ کے ریلوے نظام کا چھوٹا نقشہ بھی دے دیا۔

....

قرطبہ، تین جون 851ء

سورج کی اولین کرنیں مسجدِ قرطبہ کے مینار کو چھو رہی تھیں۔ زیادہ تر لوگ ابھی گھروں ہی میں تھے۔ جو اکا دکا دکانیں کھلی تھیں ان کے دکان دار جھاڑ پونچھ میں مصروف تھے۔ ایک شخص آہستگی سے چلتا ہوا وادی الکبیر پر بنے رومی پل سے گزر کر شہر کے وسط میں داخل ہو گیا۔ اس کا جسم

کسی قدر فربہ تھا، سر کے اکثر بال اڑ چکے تھے۔ اس کی نظریں زمین پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے مٹیالے رنگ کا جبہ پہنا ہوا تھا اور پاؤں میں چمڑے کی پھٹی ہوئی چپل تھی جس کے تسمے ٹخنوں کے گرد بندھے ہوئے تھے۔

یہ اسحٰق تھا جو تین سالہ خود ساختہ جلاوطنی کے بعد اس اجلی صبح کو قرطبہ لوٹا تھا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر مسجد کے سامنے سے گزرا اور شاہی دفاتر کے احاطے میں داخل ہوگیا۔ پہرے داروں نے ایک لحظہ توقف کے بعد اسے پہچان کر اندر جانے دیا۔ اسحٰق اپنی پر اسرار گم شدگی سے قبل کاتب الذمام یعنی قرطبہ میں عیسائیوں کے امور کا نگران تھا۔ راستے جانے پہچانے تھے، وہ سیدھا قاضی کی عدالت میں پہنچا جو ابھی ابھی وہاں پہنچ کر اپنی نشست سنبھال رہا تھا۔ اسحٰق نے مطالبہ کیا کہ وہ اسلام کے بارے میں کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔ قاضی سمجھا کہ شاید وہ مسلمان ہونا چاہتا ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب اندلس بھر میں عیسائی حلقۂ اسلام میں صف در صف داخل ہو رہے تھے۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں سے کتنے واقعی اسلام کے پیغام سے متاثر ہوئے تھے اور کتنے دنیاوی فوائد کی خاطر اپنا آبائی مذہب چھوڑنے پر آمادہ تھے، لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اندلس کے مسلمان امیر مذہبی رواداری پر یقین رکھتے تھے اور عیسائیوں اور یہودیوں کو اہلِ کتاب ہونے کے ناتے اسلامی سلطنت میں خصوصی مراعات حاصل تھیں، جن میں مذہبی فرائض ادا کرنے کی آزادی اور محدود خود اختیاری حاصل تھی۔

خود اسحٰق خود ساختہ جلاوطنی سے قبل سرکاری ملازم رہ چکا تھا اور عربی زبان روانی سے بولتا تھا۔ اس زمانے کے اندلسی عیسائیوں میں عربی بولنا نہ صرف فیشن کا درجہ رکھتا تھا، بلکہ اس کے ذریعے ان تمام علوم وفنون تک بھی رسائی حاصل کی جا سکتی تھی جو قرطبہ کے درجنوں کتب خانوں میں بند تھے۔ اسحٰق کے ہم عصر پادری پال ایلوارس نے قرطبہ کے عیسائیوں کے عربی بولنے اور مسلمانوں کی سی بود و باش اختیار کرنے کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے:

> 'عیسائی عربوں کا ادب بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ انھیں رد کر سکیں، بلکہ اس نیت سے کہ ان کے ذریعے عمدہ عربی سیکھ سکیں۔ افسوس تمام ذہین عیسائی نوجوان پیسے برباد کر کے عربی کی کتابیں خریدتے ہیں اور انھیں ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں اور عیسائی کتابوں کو

درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ لاطینی زبان میں لکھنے والے ایک عیسائی کے بدلے میں ہزار ایسے عیسائی مل جائیں گے جو مرصع عربی میں اظہارِ خیال کر سکتے ہیں۔

....

آپ جب بھی زیرِ زمین ریل سے سفر کرتے ہیں تو یہ سوال درپیش آتا ہے کہ جس پلیٹ فارم پر آپ کھڑے ہیں، وہاں آپ کی منزل کی طرف جانے والی ٹرین آئے گی، یا وہاں سے آنے والی؟ اس مشکل کا حل یہ ہے کہ آپ نقشے میں معلوم کریں کہ مطلوبہ ریل کا آخری سٹیشن کون سا ہے۔ یہی سٹیشن ریل کی پیشانی پر لکھا ہوتا ہے۔ لیکن میرا مسئلہ یہ تھا کہ جہاں مجھے جانا تھا وہاں کے لیے ایک نہیں، بلکہ تین ریلیں تبدیل کرنا پڑتی تھیں۔ ایک مہربان صورت بوڑھے نے بامحاورہ سپینش میں تفصیل سے سمجھایا کہ مجھے کن راستوں سے ہو کر جانا ہے۔ لیکن میں جب بھی اجازت مانگنے کی کوشش کرتا وہ راستا روک کر اپنا آموختہ دہرانے لگتا۔ بڑی مشکل سے اس پیرِ تسمہ پا کو 'گراسیاس' کہہ کر جان چھڑائی اور جیبی نقشے کو خضرِ راہ بنا کر ایک ٹرین میں سوار ہو گیا۔

میں نے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے ہی انٹرنیٹ کے ذریعے ہوٹل الفانتا مرسیدلیس میں بکنگ کروالی تھی اور یہ بھی معلوم کر رکھا تھا کہ اس کے قریب ترین زیرِ زمین ریلوے سٹیشن تیتوان پڑتا ہے۔ باہر نکلا تو بارش میں شدت آچکی تھی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ہوٹل یہاں سے کتنی دور ہے، اس لیے ٹیکسی لینا پڑی۔ ٹیکسی والے نے کوئی پندرہ منٹ بعد ہوٹل پہنچادیا۔ یہ الگ بات کہ بعد میں معلوم ہوا کہ ہوٹل سٹیشن سے صرف پانچ منٹ کے پیدل فاصلے پر تھا۔ اب یہ سوال سائنس سے تعلق رکھتا ہے کہ دو فرلانگ کس طرح کھنچ کر پانچ کلومیٹر بن گئے۔

الفانتا مرسیدس پنج ستارہ ہوٹل تو نہیں تھا لیکن پھر بھی پیرس والے ہوٹل سے بدرجہا بہتر تھا اور کرایہ بھی اس کی نسبت آدھا تھا۔ پیرس والے ہوٹل کا تو یہ عالم تھا کہ جب میں اس کی لفٹ کے اندر داخل ہوا تو یہ پریشانی لاحق ہو گئی تھی کہ میرا بیگ اور سوٹ کیس کیسے اس میں سوار کیے جائیں اور یہ چیزیں ٹھونس ٹھنسا کر رکھ بھی دی جائیں تو پھر لفٹ کا دروازہ کیوں کر بند کیا جائے۔ کچھ ایسا ہی حال کمرے کے باتھ روم کا بھی تھا۔

سامان رکھ کے اور جلدی جلدی کپڑے بدل کر میں باہر آیا اور کاؤنٹر پر کھڑے نوجوان سے

راستا پوچھ کر ایک بار پھر تیتوان سٹیشن پہنچ گیا۔ نقشے میں دیکھ کر میں نے 'پورتو دی سول' نامی سٹیشن کا انتخاب کیا۔ اس کا مطلب ہسپانوی زبان میں ہے 'سورج دروازہ۔'

ٹرین میں میرے فوراً بعد تین فن کار داخل ہو گئے اور آؤ دیکھا نہ تاؤ، اکارڈین، گٹار اور جھانجھن بجا بجا کر ایک ہسپانوی گیت چھیڑ دیا۔ میرے آس پاس بیٹھے مسافر بھی اس فی البدیہہ لائیو پرفارمنس سے لاتعلق نہ رہ سکے اور تالیاں بجا بجا کر تھاپ دینے لگے۔ لیکن یہ محفلِ موسیقی تھوڑی دیر ہی جاری رہ سکی۔ جوں ہی ٹرین رکی، تینوں فن کار اپنا اسباب سمیٹ کر اور شائقین سے داد اور نقدی وصول کر کے سامنے سے آنے والی گاڑی میں سوار ہو گئے۔

....

اسی دوران ٹرین نمبر 21431 چل پڑی۔ اسے سات بج کر چالیس منٹ پر اتوچا پہنچ جانا تھا، لیکن سٹیشن سے تھوڑی ہی دور سات بج کر اڑتیس منٹ پر تیسرے ڈبے میں ایک زبردست دھماکا ہوا جس سے ڈبے کے پرخچے اڑ گئے۔ سرنگ میں دھماکے کی گونج چند سیکنڈ تک سنائی دیتی رہی۔ لیکن ابھی یہ گونج ماند نہیں پڑی تھی کہ ایک اور ڈبے میں دھماکا ہوا اور چار سیکنڈ کے اندر اندر تیسرا ڈبا بھی دھم سے پھٹ گیا۔

چند منٹوں میں اسی لائن پر اتوچا ہی کی سمت جانے والی تین اور ٹرینوں میں دھماکے ہوئے اور دیکھتے دیکھتے یورپ کی تاریخ کے بدترین دہشت گرد حملوں میں سے ایک کی کارروائی مکمل ہو گئی۔ سینکڑوں زخمیوں کے علاوہ مرنے والوں کی تعداد 191 تھی، جن کا تعلق سترہ ملکوں سے تھا۔

جب امدادی کارکن وہاں پہنچے تو جو چیز سب نے محسوس کی وہ یہ تھی کہ سرنگ گرد کی موٹی تہ میں لپٹی ہوئی تھی لیکن گرد سے بھی دبیز خاموشی ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔ جیسے جہاز سمندر میں ڈوبنے کے بعد سکوت طاری ہو جاتا ہے۔ دل دہلا دینے والا اور اعصاب شکستہ کر دینے والا سکوت۔

اس پیمانے پر نہ سہی، لیکن سپین کے لیے بم دھماکے نئی بات نہیں تھے۔ شمال میں باسک عسکریت پسند ایک عرصے سے مرکزی حکومت کے خلاف نبرد آزما تھے۔ چناں چہ چند گھنٹوں کے اندر اندر سپین کے وزیرِ داخلہ نے بیان داغ دیا کہ حکومت کو اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ اس حملے کے پیچھے باسکوں کا ہاتھ ہے۔ سپین میں صرف تین دن کے بعد انتخابات مقرر تھے۔ عوامی رائے

شماری کے جائزوں میں برسرِ اقتدار پیپلز پارٹی کو نمایاں برتری حاصل تھی۔ اسی دوران وزیرِ اعظم ہوزے ایسنار نے کئی اخباروں کے دفتروں میں خود فون کر کے انھیں اطلاع دی کہ یہ باسکوں کا کام ہے۔ چند گھنٹوں کے اندر نیویارک سے باسک دہشت گردوں کی مذمت میں لگے ہاتھوں اقوامِ متحدہ کی قرارداد بھی منظور ہوگئی۔

تاہم شام ہوتے ہوتے کسی اور ہی کہانی کے تانے بانے بنے جانے لگے۔ الکا دی ہینا ریز سٹیشن کے باہر کھڑی سفید رینو وین سے پولیس کو کئی ایسی اقسام کے ایسے غیر استعمال شدہ بم ملے جو باسکوں نے کبھی استعمال نہیں کیے تھے۔ گاڑی کے ٹیپ ریکارڈر میں قرآن کی تلاوت والی کیسٹ لگی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود ایسنار حکومت کی طرف سے باسک باسک کی گردان جاری رہی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تین دن بعد ہونے والے انتخابات میں ایک اہم سوال ہسپانوی باشندوں کی اکثریت کی مرضی کے خلاف عراق میں فوجیں بھیجنا تھا۔ حکومت کسی صورت میں نہیں چاہتی تھی کہ اس سانحے کو اسلامی شدت پسندوں کے ساتھ نتھی کیا جائے۔

اس دوران ایک ایک کر کے کڑیاں جڑتی چلی گئیں۔ پولیس نے تباہ شدہ ڈبوں سے لوگوں کے بیگ اور دوسرا سامان نکال کر مرکزی نمائش گاہ میں رکھوا دیا تھا۔ اتوچا سٹیشن سے ایک بیگ ایسا ملا جس کا کوئی والی وارث سامنے نہیں آیا۔ جب پولیس نے اسے کھولا تو اس کے اندر سے ایک اہم ثبوت فراہم ہوگیا۔ بیگ کے اندر ایک اَن پھٹا بم چھپا ہوا تھا جو دو تاروں کے ذریعے موبائل فون کے ساتھ منسلک تھا۔ یہ بم نمبر تیرہ تھا۔ بم ماہرین نے بعد میں نتیجہ اخذ کیا کہ تمام بم فون کے الارم سے منسلک تھے۔ جوں ہی الارم بجتا، بارہ کلوگرام بارودی مواد دھماکے سے پھٹ پڑتا۔

....

'سورج دروازہ' پاکستانی شہروں کے صدر کی طرح میڈرڈ شہر کا دل ہے۔ یہیں سے نہ صرف میڈرڈ کی اکثر سڑکیں شروع ہوتی ہیں بلکہ سپین کی چھ بڑی شاہراہوں کا آغاز بھی یہیں سے ہوتا ہے اور یہیں سے تمام شاہراہوں کے فاصلے ناپے جاتے ہیں۔ یوں سمجھیے جیسے سورج دروازہ ایک مکڑی کی طرح سے سپین کے وسط میں براجمان ہے اور جال کی تمام لڑیاں اسی کے بطن سے پھوٹتی ہیں۔

میڈرڈ دوسرے بڑے یورپی شہروں کی نسبت نیا شہر ہے، پھر بھی سورج دروازے کے

اردگرد کی تمام عمارات صدیوں پرانی ہیں اور وسیع چوک میں سیاہ رنگ کے پتھر اور اینٹیں نصب ہیں۔ یہاں جگہ جگہ لوگ ٹولیوں میں کھڑے تیز آواز میں محوِ گفتگو نظر آتے ہیں۔ ویسے بھی ہسپانوی بولنے میں اچھی خاصی تیز رفتار اور بے تکلف سی زبان ہے۔ اس میں وہ تکلف اور رکھ رکھاؤ سنائی نہیں دیتا جو فرانسیسی کا خاصہ ہے۔ چوک کے ایک طرف ایک شخص ریڈ انڈینز کا سا حلیہ بنائے کھڑا ہے اور لوگ اس کے گرد کھڑے ہوئے یوں تماشا زن ہیں جیسے ہمارے شہروں میں سانپ اور نیولے کی لڑائی دکھانے والے اور سانڈے کا تیل بیچنے والے مداریوں کے گرد جمگھٹا رہتا ہے۔

سپین کو کچھ عرصہ پہلے تک یورپ کا 'مردِ غریب' کہا جاتا تھا۔ لیکن اب یورپی معیشت میں شامل ہونے کے بعد یہاں کے رنگ ڈھنگ بدل گئے ہیں۔ سورج دروازے کی سولھویں اور سترھویں صدی کی ہلکی سبز اور مٹیالی گلابی عمارتوں اور خمیدہ محرابوں پر اور ازمنہ وسطیٰ کے گاتھک چرچوں کے سائے تلے یوروا کانومی کے نیون سائن چمچماتے ہیں اور تنگ و تیرہ سنگی گلیوں میں نئی تراش کے سوٹوں میں ملبوس نوجوان کانوں سے بلیک بیری لگائے مصروفِ گفتگو دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن میڈرڈ کی انھی گلیوں میں مکانوں کے آگے بنے تھڑوں پر گہرے رنگوں والے فراکوں میں ملبوس عمر رسیدہ خواتین تمام تر معاشی و سماجی اتھل پتھل سے بے نیاز بیٹھی ہوئی ملتی ہیں۔ ان کے چہرے پر ایسی معصومیت پائی جاتی ہے جس کے لیے انسان کو محنت نہیں کرنا پڑتی بلکہ وہ لمبی عمر کے بعد خود بہ خود نقش ہو جاتی ہے۔

میڈرڈ شہر کا مرکز ضرور پرانا ہے، لیکن پچاس لاکھ کی آبادی والے اس شہر کے مضافات میں جنونی رفتار سے تعمیرات ہو رہی ہیں۔ جہاں تک نظر جاتی ہے، کرینیں زرد ٹڈیوں کی طرح عمارتوں کے ڈھانچوں پر جھکی نظر آتی ہیں۔ میڈرڈ کے دو چہرے ہیں اور دونوں کے درمیان اس قدر تفاوت ہے کہ لگتا ہے دو مختلف شہر ایک دوسرے کے اندر واقع ہیں۔ اس لحاظ سے میڈرڈ دو کشتیوں کا سوار نظر آتا ہے۔

پہلی دنیا کے کسی بھی شہر کو دیکھنے کا سب سے آسان نسخہ یہ ہے کہ آپ 'ہاپ آن ہاپ آف' بس کا ٹکٹ خرید لیں۔ اس قسم کی بسیں شہر کے تمام اہم مقامات کا طواف کرتی ہوئی دائرے میں سفر کرتی جاتی ہیں۔ راستے میں آپ جہاں چاہیں، اتر سکتے ہیں اور دس پندرہ منٹ بعد آنے والی اسی کمپنی کی دوسری بس میں سوار ہو سکتے ہیں۔ بس میں کئی زبانوں میں معلوماتی کمنٹری نشر ہوتی ہے،

جس کی ٹائمنگ حیران کن حد تک برجستہ ہوتی ہے۔ مثلاً 'اس وقت آپ کو دائیں طرف جو ننگی دیوار نظر آ رہی ہے یہ شاہی محل کا مغربی گوشہ ہے جسے فلپ ثانی نے تعمیر کروایا تھا۔' سامنے جو باغ نظر آ رہا ہے اگر آپ اچک کر اس کے اندر دیکھیں تو مشہور افسانوی کردار ڈان کیخو تے اور اس کے ملازم سانچو پانزو کے مجسمے نظر آئیں گے،' وغیرہ۔

میں بھی ایسی ہی ایک بس میں اچک کر سوار ہو گیا۔ اگرچہ بس ڈبل ڈیکر تھی اور اس کا اوپر والا حصہ کھلا تھا، لیکن پھوار کی وجہ سے اندر بیٹھنے ہی پر اکتفا کرنا پڑا۔ کچھ ہی دور جانے کے بعد مجھے پراڈو کا نشان نظر آیا تو میں فوراً بس سے اتر گیا۔ یہ عجائب گھر یورپی مصوری کے عمدہ ترین شاہ کاروں کے لیے دنیا بھر میں شہرت رکھتا ہے۔ میوزیم کے اندر ایک تاریک گوشے میں سپین کے عظیم مصور فرانسسکو گویا کی تصاویر کی خصوصی نمائش جاری تھی۔ گویا کے علاوہ یہاں ویلاسکوئس، ٹشن، رافیل، کاراوا جیو اور دوسرے اساتذہ کی تصاویر موجود ہیں۔

اسی میوزیم میں ویلاسکوئس کی مشہور زمانہ تصویر 'دی میڈز آف آنر' موجود ہے۔ 1985ء میں لندن کے ایک رسالے میں شائع ہونے والے سروے کے مطابق اس کو دنیا کی عظیم ترین پینٹنگ قرار دیا گیا تھا۔ بڑے سائز کی اس روغنی پینٹنگ میں شاہی خاندان کے کئی افراد بھی موجود ہیں لیکن سب سے نمایاں خود مصور ہے، جیسے اسے اپنی عظمت کا بھرپور احساس ہو۔ کئی دن بعد طولیدو میں البرتو نامی گائیڈ نے اسی تصویر کے بارے میں بتایا کہ یہ تکنیکی لحاظ سے دنیا کی تین عظیم ترین تصاویر میں سے ایک ہے۔ لیکن خیر، البرتو کا ذکرِ خیر بعد میں آئے گا۔

....

جب قرطبہ کے قاضی نے اسحٰق کو اسلام کے بارے میں بتانا شروع کیا تو اسحٰق نے اسے بیچ ہی میں ٹوک دیا، اور بجائے اسلام قبول کرنے کے اس نے اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی شان میں گستاخی کرنا شروع کر دی۔

قرطبہ کے عرب بہت روادار اور روشن خیال سہی اور ان کے لیے مذہبی مناظرے معمول کی بات سہی، لیکن ایک چیز جو وہ برداشت نہیں کر سکتے تھے وہ تھی پیغمبر کی شان میں گستاخی (با خدا دیوانہ باشد با محمد ہوشیار)۔ اسحٰق کی طرف سے سرِ عام توہینِ رسالت پر قاضی بھونچکا رہ گیا۔ اس نے اسحٰق کے منھ پر تھپڑ رسید کرنے کی کوشش کی لیکن ماتحت نے اسے روک دیا، 'جب تک جرم

ثابت نہ ہو جائے، کسی ملزم کو سزا نہیں دی جا سکتی۔' متزلزل قاضی نے پہلے تو اپنے حواس پر قابو پایا پھر اسحٰق کو موقع دیا کہ اس کا جرم ناقابلِ معافی ہے، لیکن وہ یا تو کہہ دے کہ وہ نشے میں دھت ہے یا پھر بیان دے دے کہ اس پر وقتی طور پر جنون طاری ہو گیا تھا تو اسے معاف کر دیا جائے گا۔

لیکن اسحٰق کا جنون وقتی نہیں تھا۔ سرکاری ملازم ہونے کے ناتے اور عربی جاننے کے باعث اسے اچھی طرح سے معلوم تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اس نے اپنی باتیں دہراتے ہوئے کہا کہ وہ پورے ہوش وحواس سے یہ سب کچھ کہہ رہا ہے اور جو کہہ رہا ہے اس پر پورا پورا یقین رکھتا ہے۔ قاضی کے پاس اس پر حد جاری کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ لیکن چونکہ یہ معاملہ اتنا انوکھا اور چکرا دینے والا تھا کہ اس نے امیرِ اندلس عبدالرحمٰن ثانی سے مشورہ کرنا مناسب سمجھا۔ توہینِ پیغمبر کی صرف ایک سزا تھی، موت۔ چناں چہ اسحٰق کا سر سرِ عام قلم کر کے اس کی سر بریدہ لاش دریائے کبیر کے کنارے لٹکا دی گئی۔

لیکن اگر عبدالرحمٰن ثانی یا قاضی نے یہ خیال کیا ہو اس سزا سے دوسروں کو عبرت ہو گی تو وہ دونوں غلطی پر تھے۔ دو دن بعد سینکٹی اُس (Sanctius) نامی ایک فرانسیسی عیسائی اور سابق شاہی محافظ نے اسحٰق کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اس کا جرم دہرایا اور وہی سزا پائی۔ اگلے اڑتالیس گھنٹے کے اندر اندر چھ مزید عیسائی اجتماعی طور پر توہینِ رسالت کے مرتکب ہوئے۔ ان کا مشترکہ پیغام تھا:

> 'او قاضی، ہم اپنے برگزیدہ بھائیوں اسحٰق اور سینکٹی اُس کے نظریات کی بھرپور تائید کرتے ہیں۔ تم جو سخت سے سخت سزا دے سکتے ہو، دو۔ اپنی سفاکی جتنی بڑھا سکتے ہو، بڑھا دو۔ اپنے نبی کی خاطر انتقام کی آگ میں جتنا جھلس سکتے ہو، جھلس جاؤ۔'

چھیوں کو قتل کر دیا گیا۔

....

فون کی سم سے اس کے مالک کا پتا چلانا بہت آسان ثابت ہوا۔ میڈرڈ کے وسطی علاقے میں ایک پی سی او تھا جسے تین مسلمان چلاتے تھے۔ جمال ضیغم، محمد بیکالی اور محمد شاوئی۔ تینوں کا تعلق مراکش سے تھا اور ان کی عمریں تیس برس کے لگ بھگ تھیں۔

پولیس کے پاس جمال ضیغم کا ریکارڈ موجود تھا۔ 2001ء میں پولیس نے اس کے گھر چھاپا

مارکراس کے مراکشی دوستوں کی ویڈیوز قبضے میں لیں تھیں جن میں انھیں داغستان میں روسی افواج کے خلاف برسرِ پیکار دکھایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے فلیٹ میں اسامہ بن لادن کے انٹرویو کی ایک ویڈیو بھی موجود تھی۔

....

اگلے چند ہفتوں میں تین مزید 'شہید' اسحٰق اور سینکٹی اس کی راہ پر چلے۔ پھر تین مہینے قدرے سکون رہا، لیکن قبل اس کے کہ قرطبہ کے اربابِ حل وعقد سکھ کا سانس لیتے، پہلی بار دو عورتوں نے اکٹھے اپنے آپ کو قاضی کے سامنے 'شہادت' کے لیے پیش کیا۔ ان کے نام ماریا اور فلورا تھے اور یہ دونوں مخلوط عیسائی اور مسلمان خاندانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔

22 ستمبر 852ء کو عبدالرحمٰن ثانی کے انتقال سے ایک ہفتہ قبل تک بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور مزید دو خواتین مرتکبِ توہین ہوئیں، جس سے مرتے ہوئے امیر کی مایوسی اور جھلاہٹ میں یقیناً اضافہ ہوا ہوگا۔ عبدالرحمٰن کے بعد اندلس کے تخت پر اس کا بیٹا محمد بن عبدالرحمٰن متمکن ہوا، جسے عام طور پر محمد اوّل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

محمد اوّل کا دورِ حکومت شورشوں اور فتنوں سے مملو تھا۔ اس دوران نہ صرف عیسائیوں کی طرف سے کئی بغاوتوں نے سر اٹھایا، بلکہ بعض علاقوں میں مولدون * بھی امیر کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک مولد موسیٰ بن موسیٰ نے شمال کی عیسائی ریاستوں کے ساتھ مل کر اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا، جب کہ دوسری جانب بنو امیہ سے تعلق رکھنے والے فوجی افسر ابن مروان نے بھی امیر کے خلاف فوج کشی شروع کر دی۔ حالات یہاں تک پہنچے کہ امیر کو باداجوز کا شہر ابن مروان کے حوالے کرنا پڑا۔

لیکن محمد اوّل کا سب سے بڑا دردِ سر توہینِ اسلام کا یہ وبال تھا جس نے اس کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔ وہ اس فتنے کو جڑ سے اکھاڑنے کے درپے تھا۔ اس لیے اس نے خاصی سوچ بچار کے بعد گذشتہ ہسپانوی امیروں کے دور میں عیسائیوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ ختم کرتے ہوئے تمام عیسائیوں کو سرکاری ملازمتوں سے برخاست کر دیا۔

....

---

* سپین کے اصل باشندے جنھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

میڈرڈ میں قدیم آبادی کے آثار ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں زمانہ قبلِ مسیح میں بھی آبادی رہی ہوگی، لیکن میڈرڈ تاریخ میں نویں صدی عیسوی میں اندلس کے امیر محمد بن عبدالرحمٰن اوّل کے عہد میں داخل ہوتا ہے جس نے دریائے منسانارلیس کے دائیں کنارے پہاڑی پر قلعہ تعمیر کروایا تھا۔ یہ قلعہ مسلم سلطنت کی شمالی سرحد پر تعمیر کردہ فوجی چوکیوں اور قلعوں کی زنجیر کی ایک کڑی تھا جو وسطی ہسپانیہ سے طولیدو تک پھیلی ہوئی تھی۔ ان قلعوں کے درمیان دن کو دھوئیں اور رات کو الاؤ کے ذریعے پیغام رسانی کی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ میڈرڈ والے قلعے کے آس پاس آبادی بڑھتی گئی۔ قلعے میں موجود فوجیوں کی سہولت کی خاطر وہاں چھوٹا سا بازار کھل گیا جس نے چند عشروں کے اندر اندر ایک پھلتے پھولتے قصبے کو جنم دے دیا۔

میڈرڈ کے نام کے بارے میں بڑی قیاس آرائیاں کی گئی ہیں، لیکن جدید تاریخ دانوں کی اکثریت کا خیال ہے کہ یہ لفظ عربی سے آیا ہے۔ یہاں آباد ہونے والے مسلمانوں نے اس جگہ کو 'مجریط' کا نام دیا تھا، جس کا مطلب ہے 'پانی کا منبع'۔ بعد میں مجریط بگڑ کر میڈرڈ بن گیا۔

میرے پاس ایک نقشہ تھا جس میں 'دیوارِ عرب' نامی ایک جگہ کا ذکر تھا جو میڈرڈ میں اس دور کے مسلمانوں کی واحد یادگار ہے۔ میں اسی نقشے کی انگلی تھام کر چلتا گیا۔ سورج دروازے سے شمال کی سمت ٹیڑھی میڑھی اور اونچی نیچی گلیوں سے گزر کر ایک پل آتا ہے جس کے دونوں کناروں پر شیشے لگے ہوئے ہیں جہاں سے دور نیچے ایک سڑک گزرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ معلوم ہوا کہ یہاں سے بہت سے لوگوں نے کود کر خودکشی کی تھی جس کے بعد سے یہ شیشہ نصب کیا گیا ہے۔ یہاں سے دونوں اطراف نشیب میں درختوں کے سلسلے پھیلے ہوئے ہیں۔ میں کئی غلط گلیاں مڑنے کے بعد بالآخر دیوارِ عرب تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔

لیکن اگر آپ کا خیال ہو کہ دیوارِ عرب دیوارِ چین جیسی کوئی پرشکوہ اور گراں ڈیل فصیل ہوگی تو آپ غلطی پر ہیں۔ بلکہ مجھے تو اس دیوار کو دیکھ کر کسی قدر مایوسی ہوئی کہ محمد اوّل کی نویں صدی کے وسط میں تعمیر کردہ عمارت کی صرف ایک اکھڑی ہوئی دیوار اور چند ٹوٹی پھوٹی محرابیں ہی باقی ہیں، جو زبانِ حال سے اپنی بدحالی کا رونا رو رہی ہیں۔ دیوار میں ٹیڑھے میڑھے پتھر نصب ہیں اور کہیں کہیں سے سرخ رنگ کی چھوٹی چھوٹی اینٹیں بھی جھلک رہی ہیں۔ دیوار کے نیچے ایک چھوٹا سا گرد سے ڈھکا ہوا میدان ہے۔ معلوم ہوا کہ یہاں گرمیوں کی راتوں کو موسیقی کے مقابلے منعقد کیے

جاتے ہیں۔ ایک طرف ایک نئی عمارت کی دیوار پر نیلے رنگ کی تختی نصب ہے جس پر ہسپانوی زبان میں 'پارک امیر محمد اوّل' ضرور لکھا ہے، لیکن اس کے علاوہ اس تاریخی مقام کے تحفظ کے لیے کچھ نہیں کیا گیا۔ ان کھنڈروں کے بالکل اوپر او نچائی پر ایک زبردست اور پرہیبت چرچ تعمیر کیا گیا ہے، جس کے دبدبے کے سامنے سارا علاقہ سہم کر دبکا ہوا سا لگتا ہے۔

نو مہینے تک خاموشی چھائی رہی، جس سے ممکن ہے امیر محمد اوّل کو کسی حد تک اطمینان کا احساس ہوا ہو، لیکن اگلی گرمیوں کے آتے آتے یہ سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔ 13 جون 853ء کو ایک اور عیسائی خاتون فینڈ یلا نے یہی جرم دہرایا اور سر گنوا بیٹھی۔ اس کے اگلے ہی دن تین مزید عیسائی دار پر چڑھ گئے۔

851ء سے 859ء تک کل اڑتالیس عیسائیوں نے اسی انداز سے موت کو دعوت دی۔ ان سب 'شہدا' کی زندگیوں کا احوال ایک پادری یولی جیئس نے قلم بند کیا ہے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ یہ یولی جیئس ہی تھا جس نے اسحٰق اور دوسرے ابتدائی 'شہدا' کو اکسایا تھا۔ وہ اس کڑی کا آخری فرد تھا جس نے 859ء میں اپنی قربانی دی۔

آنے والے عیسائی ادوار میں ان افراد کی ہلاکت کی بڑے پیمانے پر تشہیر کی گئی اور انھیں عیسائیت کے ہیرو بنا کر پیش کیا گیا۔ حقیقت کے ساتھ افسانے ملا کر 'شہدا' کے ساتھ کئی معجزانہ واقعات نتھی کر دیے گئے۔ یولی جیئس سمیت ان میں سے کئی کو درجۂ ولایت پر فائز کر دیا گیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان افراد کا محرک کیا تھا۔ اگر مسلمان سلطنت میں عیسائیوں کی حالتِ زار کی طرف توجہ دلانی مقصود تھی تو اس کا بھی کوئی جواز نہیں بنتا کیوں کہ بہ شمول اسحٰق ان میں سے کئی شاہی ملازمت میں تھے۔ امیر الحکم اوّل (822-794) کے خصوصی ذاتی محافظ دستے کا سربراہ ایک عیسائی ربیع بن تھیودلف تھا۔ یہی ربیع قرطبہ کا افسرِ محصول یا ٹیکس کلکٹر بھی تھا۔ قرطبہ کی بیوروکریسی کے دروازے عیسائیوں کے لیے کھلے ہوئے تھے۔ خود امیر محمد اوّل کا ایک مجسٹریٹ ارگی میرس نامی عیسائی تھا، جب کہ عیسائیوں اور یہودیوں کے لیے مترجم، کلرک، سیکریٹری وغیرہ کے عہدے موجود تھے۔

اگر ان شہدا کا مقصد عیسائیوں کو بڑے پیمانے پر اکسانا تھا کہ وہ بغاوت کر کے مسلمانوں کو سپین سے نکال باہر کریں تو وہ اس میں بھی کامیاب نہیں ہو سکے۔ حتیٰ کہ خود کلیسا نے بھی ان کے

اقدامات کی مذمت کرتے ہوئے ان 'شہدا' کو جنونی قرار دیا۔ یولی جیئس نے اس بات کا شکوہ کیا ہے کہ قرطبہ کے بشپ ریکا فریدس نے یولی جیئس پر شدید نکتہ چینی کرتے ہوئے اسے تنبیہ کی تھی کہ وہ اپنی حرکتوں سے باز آ جائے۔ ادھر عام عیسائیوں پر ان شہدا کی سرگرمیوں کا کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ آنے والے عشروں میں وہ مزید زور وشور سے 'مستعرب' (یعنی عربوں کے رنگ میں رنگا ہوا) ہوتے چلے گئے۔ رفتہ رفتہ یہی لفظ مستعرب انگریزی اور ہسپانوی میں عام بول چال کا حصہ بن گیا اور ان عیسائیوں کے لیے استعمال ہونے لگا جنھوں نے عرب رسم ورواج اختیار کر لیے تھے۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ جنگ عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان نہیں تھی، بلکہ بنیاد پرست عیسائیوں اور مستعرب عیسائیوں کے درمیان تھی۔ تاہم یہ جنگ ناکام رہی کیوں کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ قرطبہ میں مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کے درمیان ثقافتی اور تہذیبی روابط بڑھتے چلے گئے۔

....

ضیغم کا خاندان 1983ء میں ابنِ بطوطہ کے شہر طنجہ سے ہجرت کر کے میڈرڈ میں آباد ہوا تھا۔ وہ 29 سال کا عام سا نوجوان تھا، گھنگریالے سیاہ بال، گندمی رنگت، فرنچ کٹ داڑھی۔ ضیغم کی میڈرڈ میں موبائل فون کی دکان تھی، جس کا نام اس نے 'نئی صدی' رکھا تھا۔ وہ جدید فیشن کے لباس پہنتا تھا اور اس کے دوستوں کے بقول اس کی کئی لڑکیوں سے دوستی تھی۔ جب کبھی ضیغم طنجہ جاتا تو اس کی ملاقاتیں عسکریت پسند تنظیم سلفیہ جہادیہ کے ارکان سے ہوا کرتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ سلفیہ کے القاعدہ سے روابط ہیں۔ وہیں اسے شعلہ بیان جہادی مقرر محمد فیاضی کی تقاریر سننے کا بھی موقع ملا جن میں 'کافروں' کو نیست ونابود کرنے کا درس شامل ہوتا تھا۔ بیکالی نے تتیتوان یونی ورسٹی سے گریجویشن کی تھی اور وہ ریال میڈرڈ ٹیم کا بڑا مداح تھا۔ وہ اکثر برطانوی فٹ بالر ڈیوڈ بیکہم کی قمیص پہنے ہوئے نظر آتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ سگریٹ پیتا تھا اور لڑکیوں کے ساتھ ساحل پر گھومتا پھرتا تھا۔

....

میری اگلی منزل اتوچا کا ریلوے سٹیشن تھا۔ اس لیے نہیں کہ یہاں چار سال قبل ہلاکت خیز دہشت گردی ہوئی تھی، بلکہ اس لیے کہ اس سٹیشن کے سامنے میڈرڈ کا مشہورِ زمانہ رائنا صوفیہ آرٹ

میوزیم ہے۔ اگرچہ یہاں میرو اور سلواڈور ڈالی سمیت کئی بڑے مصوروں کے شاہ کار موجود ہیں لیکن اس عجائب گھر کی سب سے نمایاں سوغات پکاسو کی مشہور ترین پینٹنگ 'گورنیکا' ہے۔ جہازی سائز کی یہ سیاہ و سفید روغنی تصویر میوزیم کی دوسری منزل کے کمرہ نمبر چھ میں آویزاں ہے۔ ویسے تو میں نے کئی کتابوں میں اس پینٹنگ کی تصاویر دیکھ رکھی تھیں، لیکن کتاب میں چند انچ کی تصویر دیکھنا اور بات ہے اور 25 فٹ ضرب 11 فٹ کی اصل پینٹنگ کے سامنے کھڑا ہو کر اس کا مشاہدہ کرنا بالکل مختلف تجربہ ہے۔ پکاسو نے یہ تصویر 1937ء میں گورنیکا نامی ہسپانوی قصبے پر جرمن جنگی طیاروں کی وحشیانہ بم باری کی یاد میں بنائی تھی، لیکن اس کے بعد سے اس نے وسیع تر معانی اختیار کر لیے ہیں اور اسے دنیا بھر میں بے گناہ شہریوں پر جنگی مظالم کے خلاف احتجاج کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

زمین پر لیٹے ہوئے کٹے پھٹے اجسام، ادھر ادھر بکھرے ہوئے اعضا، کرب سے تڑپتے ہوئے چہرے، بے بسی سے آسمان کی سمت اٹھے ہوئے ہاتھ، شعلوں میں گھری ہوئی شکستہ دیواریں، ایک عورت کی بانھوں میں مردہ بچہ اور درد کی شدت سے بلبلاتا ہوا گھوڑا اس عظیم پینٹنگ کے چند نمایاں پیکر ہیں، جو ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ انسان مذہبی، سیاسی اور مالی مفادات کی خاطر کس حد تک پستی میں گر سکتا ہے۔

....

میڈرڈ کے بم دھماکوں کے پیچھے اسلامی جہادیوں کا ہاتھ ہونے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی۔ عوام کی اکثریت کا خیال تھا کہ دہشت گردی اس لیے ہوئی ہے کہ سپین کی فوجیں عراق میں امریکا کے شانہ بہ شانہ لڑ رہی ہیں۔ لوگ رات بھر میڈرڈ کے دل 'سورج دروازہ' کے چوک پر دھرنا دے کر بیٹھے رہے۔ اگلے دن میڈرڈ کی گلیوں میں تیس لاکھ لوگوں نے جلوس نکالا اور تمام شہر کو مسدود کر کے رکھ دیا۔ لوگوں کے لبوں پر ایک ہی نعرہ تھا، 'تمھاری جنگ، ہمارے لاشے۔' اگلے دن عام انتخابات تھے۔ لوگوں نے ریکارڈ تعداد میں حصہ لیا اور ہوزے ایسنار کی پیپلز پارٹی کو ہسپانوی تاریخ کی بدترین انتخابی شکست سے دوچار کر دیا۔

اسامہ بن لادن اور اس کے ساتھیوں نے اندلس میں خصوصی دل چسپی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اکتوبر 2001ء میں جب امریکا نے افغانستان پر بم برسانا شروع کیے تو اسامہ نے ایک وڈیو

ٹیپ جاری کی تھی جس میں اس نے دعویٰ کیا تھا کہ اندلس مسلمانوں کا ہے۔ اسامہ کے نمبر دو ایمن الظواہری نے بھی اندلس کے بارے میں کہا ہے کہ ہم کسی کو اندلس کے المیے کو دہرانے نہیں دیں گے۔ دو مہینے بعد اسامہ نے الجزیرہ پر نشر ہونے والی ایک ٹیپ میں اندلس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تاسف ظاہر کیا تھا کہ تمام مسلم امہ کی معیشت ایک ایسے ملک کی معیشت سے بھی چھوٹی ہے جس پر کبھی اس کی حکمرانی تھی۔ الظواہری کو القاعدہ کا روح و رواں سمجھا جاتا ہے اور وہ مصری مفکر سید قطب کے شاگردوں میں سے ایک ہے۔ سید قطب کا نظریہ تھا کہ غیر اسلامی ظالم حکومت کو تشدد کے ذریعے ہٹانا جائز ہے۔ بعد میں الظواہری اور اس کے حواریوں نے اس نظریے کو سائنس کا درجہ دے دیا۔ ان کا خیال ہے کہ دہشت گردی کے پے در پے واقعات سے عوام مقتدرہ سے اس حد تک مشتعل اور متنفر ہو سکتے ہیں کہ وہ بڑی تحریک کی صورت اختیار کر کے حکومتوں کا تختہ الٹ سکتے ہیں۔ حیرت انگیز اتفاق ہے کہ عین یہی نظریہ نویں صدی کے ہسپانوی 'شہیدوں' کا بھی تھا۔

2006ء میں ایسنار نے واشنگٹن کی جارج ٹاؤن یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ میڈرڈ کی دہشت گردی کو سمجھنے کے لیے کیلنڈر کو 711ء تک واپس لے جانا ہوگا۔ یہ وہ سال تھا جب طارق بن زیاد کی فوج نے سپین کی سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ ایسنار کے اس فقرے کی بازگشت اب تک سنائی دے رہی ہے:

'سپین کا القاعدہ کے ساتھ ٹکراؤ آٹھویں صدی ہی میں شروع ہو گیا تھا۔'

....

سیاحتی بس میں پورے میڈرڈ کا طواف کر کے واپس سورج دروازے پر آ پہنچا۔ شام کے سائے گہرے ہو چلے تھے اور بھوک کے مارے برا حال تھا۔ پچھلے دو دن سے برگر کنگ اور کے ایف سی سے فش برگر کھا کھا کر طبیعت اوب گئی تھی اور اب دل کرتا تھا کہ کوئی دیسی سا کھانا کھایا جائے۔ میں اندازاً ایک پر رونق گلی میں چلتا گیا کہ کہیں کوئی انڈین ریستوران مل جائے تو بات بن جائے۔ اس گلی میں دکانوں کی عمارات صدیوں پرانی لیکن ان کی آرائش اور سامانِ فروخت بے حد فیشن ایبل تھے۔

کچھ دور دو انڈین لڑکے کھڑے اشتہار بانٹتے ہوئے ملے، معلوم ہوا کہ یہ 'تاج محل ریستوران' کی تشہیری مہم چلا رہے ہیں۔ خیر، اندھے کو کیا چاہیئے، ان سے پتا لے کر میں سیدھا

ریستوران پہنچ گیا۔ میرا دعویٰ ہے کہ آپ دنیا کے کسی بھی شہر میں چلے جائیں، آپ کو وہاں 'تاج محل ریستوران' ضرور ملے گا، جس سے دو باتوں کا پتا چلتا ہے، ایک تو یہ کہ بھارتی دنیا کے ہر خطے میں بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں، اور دوسرے یہ کہ مغرب میں بھارتی کھانے مقبول ہو رہے ہیں۔ اس چھوٹے سے لیکن قرینے سے سجے 'تاج محل مغل ریستوران' کی دالِ ماش اور گرما گرم چپاتیوں کا ذائقہ اب بھی یاد ہے۔

اگلی صبح قرطبہ کا سفر درپیش تھا۔ قرطبہ۔۔۔ جو کبھی کائنات کا مرکز تھا۔ قرطبہ۔۔۔ کتابوں کا شہر، علوم وفنون کا مرکز۔ قرطبہ۔۔۔ دنیا کے ماتھے کا جھومر۔

مہم جو شہزادی

739ء

دمشق کے باہر رصافہ کے مقام پر اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک کا دربار لگا ہوا ہے۔ خلیفہ کی سلطنت فرانس کی سرحدوں سے لے کر دریائے سندھ تک پھیلی ہوئی ہیں، جس کا اظہار دربار کے شان و شکوہ اور وقار سے ہو رہا ہے۔ صحرا نشین عرب محلات سے بیگانہ تھے، اس لیے دربار کی تزئین و ترتیب کے لیے بازنطینی ماڈل کی پیروی کی گئی ہے۔ سنگِ مرمر کے عالی شان ستونوں پر نازک حریری پردے لہرا رہے ہیں جن پر سونے کے تاروں سے کڑھائی کی گئی ہے۔ تخت نشین خلیفہ کے پیچھے مسلح خواجہ سرا ہاتھ باندھے مستعد کھڑے ہیں۔ بائیں ہاتھ پر تمام اعلیٰ عمال اور سردار حسبِ مراتب ایستادہ ہیں، جب کہ خلیفہ کے دائیں ہاتھ پر اموی خاندان کے سرکردہ عمائد اور شہزادے موجود ہیں۔ انھی میں ولی عہد ولید بن یزید ثانی بھی ہے۔ قطار کے آخر میں ایک سرخ بالوں والا لڑکا مؤدب اور باملاحظہ کھڑا ہے۔ یہ خلیفہ کے دوسرے بیٹے عبدالملک کا چشم و چراغ ہے۔

حاجب اعلان کرتا ہے:

'ہسپانوی شہزادی سارہ قوطیہ باریابی کی طلب گار ہیں۔'

خلیفہ کے سر کا خفیف اشارہ پا کر حاجب الٹے قدموں باہر چلا جاتا ہے اور کچھ دیر کے بعد شہزادی اور اس کے بھائیوں کو لے کر خدمتِ عالیہ میں پیش کرتا ہے۔ ہسپانوی شہزادی کی عمر بہ مشکل پندرہ برس ہے، لیکن اس کی آنکھوں میں اعتماد کی چمک ہے۔ اس نے بازنطینی ریشم سے بنا نیلے رنگ کا لمبا جبہ پہنا ہوا ہے جو سیاہ نوک دار جوتوں تک پہنچتا ہے۔ کمر پر سفید رنگ کا پٹکا بندھا ہوا ہے، سر پر سفید ہی رنگ کا لمبا رومال ہے جس نے گردن کو بھی مکمل طور پر ڈھانپ رکھا ہے۔ البتہ ماتھے پر رومال کے اندر سے بھورے بالوں کا شعلہ سا لہرا رہا ہے۔ یہ شہزادی ہزاروں میل کا

انتہائی پرخطر اور دشوار گزار سفر طے کر کے امیر المومنین کی خدمت میں فریادی بن کر حاضر ہوئی ہے۔ ایسا جوکھم کا سفر جس کا تصور کر کے ہی بڑے بڑوں پر لرزہ طاری ہو جائے۔

سارہ قوطیہ نے اس طویل مہم کا آغاز ہسپانوی شہر اشبیلیہ سے کیا ہے۔ اپنے دو کم سن بھائیوں کو لے کر وہ کشتی کے ذریعے دریائے وادی الکبیر کے راستے بحرِ اقیانوس کے دہانے تک پہنچی، جہاں سے اس نے نسبتاً بڑی کشتی میں بیٹھ کر مشرق کی طرف بحیرۂ روم کا سفر اختیار کیا اور آبنائے جبرالٹر سے ہوتی ہوئی قدیم فلسطینی بندرگاہ عسقلان تک پہنچ گئی۔ وہاں سے دارالخلافہ دمشق تک پونے دو سو میل کی بقیہ مسافت خشکی کے راستے طے ہوئی۔ اس سفر کے دوران کتنی بار بحری قزاقوں کا خطرہ لاحق ہوا، کتنی بار کشتی طوفانی موجوں میں گھر گئی، ارضِ فلسطین سے گزرتے ہوئے کتنی ایسی خستہ حال سراؤں میں قیام کرنا پڑا جہاں شہزادی کی دمکتی رنگت، بھورے بال اور نامانوس لباس اور نشست برخاست دیکھ کر دوسرے مسافروں نے چہ میگوئیاں شروع کر دیں۔ وہ تو بھلا ہو شہزادی کے جاں نثار عرب ملازموں کا، جو ایسے ہر موقعے پر سینہ سپر ہو گئے ورنہ اس زمانے میں کسی عورت کے لیے اتنا لمبا سفر کرنا ناممکن تھا۔

امیر المومنین نے ہاتھ اٹھا کر شہزادی کا خیر مقدم کیا اور اجازت دی کہ وہ اپنی درخواست پیش کرے۔ سائلہ مترجم کے ذریعے معروض گزار ہوئی کہ وہ سلطنتِ ہسپانیہ کے آخری وزی گاتھک بادشاہ وتیزا کی پوتی ہے۔ طارق بن زیاد کے جبل الطارق پر ورود سے ایک برس قبل بادشاہ کا جلاوطن بھتیجا راڈرک اٹلی سے لشکر لے کر حملہ آور ہوا اور وتیزا کو اس کی راج دھانی طلیطلہ سے معزول کر کے اندھا کر دیا اور قرطبہ کے زندان میں ڈال دیا۔ اگرچہ اگلے ہی برس طارق بن زیاد نے راڈرک کی افواج کو شکستِ فاش دے کر تمام ہسپانیہ پر اموی پرچم لہرا دیا، لیکن بربر جرنیل نے اور ایک برس بعد ہسپانیہ میں اترنے والے شمالی افریقہ کے گورنر موسیٰ بن نصیر نے اکثر علاقوں میں ہسپانوی سرداروں ہی کو برقرار رکھا۔ سارہ کے والد اشبیلیہ کے امیر تھے، لیکن ان کے انتقال کے بعد سارہ کے چچا ارطوباس نے اپنے بھائی کی تمام جائیداد پر قبضہ کر کے سارہ کو بے دخل کر دیا۔ اگرچہ اموی عمال نے حکم جاری کیا تھا کہ اسلامی قانون کے تحت بیٹی کو باپ کی جائیداد وراثت میں مل سکتی ہے، لیکن اس دوران اسلامی سلطنت کا دور افتادہ ہسپانوی صوبہ اس قدر بدنظمی کا شکار تھا کہ ہر مہینے کہیں نہ کہیں بغاوت سر اٹھا لیتی تھی۔ ادھر خود خلافتِ بنو امیہ عباسیوں کے بڑھتے ہوئے

اقتدار، خارجیوں کے فتنے اور بربروں کی شورش جیسے دوسرے کئی مسائل میں الجھی رہی کہ اس حکم پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔ اب سارہ، جس نے رضا و رغبت مذہبِ اسلام قبول کر لیا ہے، خود اپنی عرضی لے کر خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہے اور چاہتی ہے کہ اسلامی قانون کی تحت بیٹی کو اس کے باپ کی جائیداد میں حصہ دیا جائے۔

خلیفہ المومنین ہشام بن عبدالملک سارہ کی جرات اور حوصلہ مندی سے بے حد متاثر ہوا۔ اس نے فوراً شمالی افریقہ کے امیر حنظلہ ابن صفوان قلبی کے نام فرمان بھیجا کہ سارہ کی تمام جائیداد فی الفور اس کے حوالے کی جائے اور اس سلسلے میں اس کی ہر ممکن مدد کی جائے۔ خلیفہ نے مزید عنایت کا مظاہرہ کرتے ہوئے سارہ کی شادی اپنے امیر عیسیٰ ابنِ مزاحم سے بھی کروا دی۔ یہ جوڑا اکٹھے اشبیلیہ پہنچا، جہاں شاہی فرمان کے مطابق اندلس کے امیر ابوخطاب قلبی نے تمام ضروری کارروائی پہلے ہی مکمل کر دی تھی۔ سارہ اور عیسیٰ کے دو بیٹے ہوئے، ابراہیم اور اسحٰق۔ سارہ کی کہانی ہم تک ابراہیم کے پوتے ابوبکر ابن قوطیہ کے ذریعے پہنچی ہے، جو فخر سے اپنے نام کے ساتھ ابنِ قوطیہ لکھتا تھا، جس کا مطلب ہے 'گاتھک عورت کا بیٹا'۔

755ء میں عیسیٰ کا انتقال ہو گیا اور سارہ ایک بار پھر بے یار و مددگار رہ گئی۔ لیکن اسی دوران ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے الاندلس کی تاریخ بدل کر رکھ دی۔ سارہ نے سنا کہ قرطبہ میں ایک نوجوان اموی شہزادے نے آ کر امارت کا دعویٰ کر دیا ہے۔ سارہ نے سترہ برس قبل دمشق کے دربار میں کئی اموی شہزادوں کو دیکھا تھا، اس لیے وہ دوبارہ وہی عرضی لے قرطبہ پہنچ گئی۔ وہاں جا کر اس نے دیکھا کہ ہشام بن عبدالملک کے دربار میں اس نے عبدالرحمٰن نامی جس سرخ بالوں والے دبلے پتلے آٹھ سالہ بچے کو خلیفہ کے دائیں جانب قطار کے آخر میں ہاتھ باندھے اور نظریں جھکائے کھڑا دیکھا تھا، اور جو خلیفہ کے بیٹے معاویہ کا فرزندِ ارجمند تھا، اب وہی عبدالرحمٰن تاریخ کے عجیب و غریب پھیر کے تحت قرطبہ پہنچ کر وہاں کا امیر بن گیا تھا۔ عبدالرحمٰن کی داستان رونگٹے کھڑے کر دینے والی سنسنی خیزی اور لحہ بہ لحہ بدلتی ہوئی ڈرامائی صورتِ حال کی وجہ سے کسی جاسوسی ناول سے کم نہیں ہے۔

اے حرم قرطبہ

میں گیارہ مئی 2008ء کی ایک چمکیلی سہ پہر عبدالرحمٰن اول کی سنہ 786ء میں تعمیر کردہ مسجدِ قرطبہ کے احاطے میں کھڑا تھا جو دنیا بھر میں اسلامی طرزِ تعمیر کے قدیم ترین اور اعلیٰ ترین شاہ کاروں میں سے ایک سمجھی جاتی ہے۔ میرے اور حرمِ قرطبہ کے درمیان صرف ایک دیوار کی دوری حائل تھی۔ اس وقت دل کی کیفیت کچھ عجیب سی تھی، اعصاب پر سنسنی سی چھائی ہوئی تھی، ہاتھ پاؤں پھولے جاتے تھے۔

میرے ذہن میں ایک دھندلی سی شبیہ تو ضرور موجود تھی۔ میں نے علامہ اقبال کی مسجد کے اندر مصلا بچھا کر نماز پڑھتے ہوئے دھندلی سی تصویر بھی دیکھ رکھی تھی، مستنصر حسین تارڑ کی بیان کردہ تفصیلات بھی نظروں کے سامنے گھوم رہی تھیں، لیکن میں ٹھیک ٹھیک نہیں جانتا تھا کہ اس بھاری بھوری دیوار کے پیچھے کیسا منظر میرا استقبال کرے گا۔

لیکن ہم شاید وقت سے تھوڑا پہلے قرطبہ پہنچ گئے ہیں۔ میں یہ تو بتانا بھول ہی گیا کہ میڈرڈ سے یہاں تک پہنچا کیسے۔

میڈرڈ سے قرطبہ کا چار سو کلومیٹر کا سفر صبح ساڑھے سات بجے شروع ہوا۔ گذشتہ رات میں اپنا پرانا ہوٹل چھوڑ کر ہوٹل فلوریدا انورتے میں منتقل ہو چکا تھا، جو کہ نسبتاً بہتر ہوٹل تھا۔

ٹور بس اپنے مقررہ وقت پر روانہ ہوئی۔ ٹور گائیڈ صاحب کا نامِ نامی ڈان ہوان تھا۔ یہ انگریزی تو بول لیتے تھے، لیکن ایک طرف تو محاورے میں لغزش کر جاتے تھے تو دوسری طرف تلفظ کے بھی کچھ مسائل تھے۔ مثال کے طور پر یہ جہاں انگریزی کا حرف H آتا، یہ اسے خ کی طرح بولتے تھے، مثلاً ہوٹل کو خوتل اور ہاؤس کو خاؤس کہتے تھے۔ لیکن خیر انگریزی کا مسئلہ پورے سپین میں آڑے آتا رہا۔ سوائے میڈرڈ میں ایک خاتون فارماسسٹ کے، میں نے پورے ملک میں

کسی کو گزارے کے قابل انگریزی بھی بولتے ہوئے نہیں پایا۔ کہتے ہیں کہ شاید غیور قوموں کی یہی نشانی ہے۔

دوسری خوبی ڈان 'خوان' صاحب میں یہ تھی کہ بہت بولتے تھے، مسلسل بولتے تھے، اور بے تکان بولتے تھے۔ میڈرڈ سے انھوں نے مائیک ہاتھ میں تھام کر جولندھور بن سعدان کی داستان چھیڑی ہے تو جب تک بس منزلِ مقصود تک پہنچ کر رک نہیں گئی، ان کی گل افشانیِ گفتار جاری رہی۔

میڈرڈ سے باہر نکلنے کے لیے ایک سرنگ کا سہارا لینا پڑا۔ گائیڈ صاحب فرمانے لگے کہ یہ سرنگ ساٹھ کلومیٹر طویل ہے اور اسے صرف چار سال کے قلیل عرصے میں تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ شہر کے گرداگرد رِنگ روڈ کا سا کام کرتی ہے۔ میڈرڈ سے باہر آ کر بس نے کھلی فضا میں سانس لیا۔ اب مضافات کا آغاز ہو چکا تھا، اور یہاں ہر طرف وہی تعمیرات کا سلسلہ نظر آ رہا تھا جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔

سپین کا فراخ آسمان کسی گنبد کی طرح منظر پر چھایا ہوا لگتا ہے۔ میں نے یہ آسمان کبھی بھی مکمل نیلا نہیں دیکھا، جب بھی دیکھا، جگہ جگہ اون کے رنگ برنگے گولوں کی طرح بادل سلوموشن میں لڑھکتے پائے۔

دو گھنٹے بھر کے میدانی سفر کے بعد پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سڑک کوہِ مورینا کی پہاڑیوں پر لپٹتی ہوئی اوپر چڑھی، اور پھر دوسری طرف جا کر جیسے لپٹی تھی، ویسے ہی ادھڑتی چلی گئی۔ یہاں سے اندلوسیا کا خودمختار خطہ شروع ہو گیا تھا۔

ہم ای 5 نامی موٹروے پر چلے جا رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد سفید رنگ کے بورڈوں پر سیاہ رنگ سے Cordoba لکھا ہوا نظر آنا شروع ہو گیا، جس سے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ بے حد عمدہ سڑک پر حدِ رفتار 100 کلومیٹر تھی۔ کچھ دیر بعد سڑک کے دونوں اطراف ہلکی پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جن پر چھدرے اور بونے درخت تھے۔

1979ء کے آئین کے تحت سپین کو 17 خودمختار خطوں میں تقسیم کیا گیا ہے، جن میں سے اندلوسیا سب سے زیادہ گنجان آباد خطہ ہے۔ اپنے دور میں مسلمان تمام سپین کو الاندلس کہتے تھے، لیکن آج اندلوسیا جنوبی سپین میں ایک خطے یا ریجن کا نام ہے، جو آٹھ صوبوں پر مشتمل ہے۔ ان صوبوں میں جائین کے علاوہ قرطبہ، اشبیلیہ اور غرناطہ شامل ہیں۔ یہ خطہ سپین کے نسبتاً پسماندہ

علاقوں میں شامل ہوتا ہے۔ یہ الگ بات کہ سپین دنیا بھر میں جن چیزوں سے جانا جاتا ہے وہ اندلوسیا ہی کی بدولت ہیں۔ ان میں فلیمنکو رقص و موسیقی، بل فائیٹنگ، اور اسلامی تہذیب کے آثار شامل ہیں۔

....

سارہ قوطیہ کو دیکھتے ہی میری تمام پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ سولہ برس قبل وہ رصافہ میں میرے دادا خلیفہ المومنین ہشام عبدالملک کے دربار میں پیش ہوئی تھی تو خلد آشیانی نے اس کے ساتھ شفقت و ہمدردی کا برتاؤ کیا تھا۔ میں اس وقت بہت چھوٹا تھا لیکن مجھے خاص طور پر اس کی شادی کی تقریبات یاد ہیں جو بڑی دھوم دھام سے منائی گئی تھیں اور ان میں تمام اموی خانوادے نے حصہ لیا تھا۔

میرے صحرا نورد اموی اجداد کو دمشق کے قدیمی شہر کی بھیڑ بھاڑ پسند نہیں تھی اس لیے انھوں نے صحرا میں رُصافہ کے مقام پر ٹھکانا بنا لیا تھا جہاں ہمارے خاندان کے تمام افراد اکٹھے رہتے تھے۔ صحرا کے بیچوں بیچ بلند دیواروں کی پناہ میں گھرا ہوا یہ نخلستان ہماری چھوٹی سی دنیا تھی۔ یہاں ویسے تو دنیا جہان کی آسائشیں مہیا تھیں لیکن میری عمر کے سبھی اموی شہزادوں کو سخت محنت و مشقت بھی کرنا پڑتی تھی۔ ہماری تعلیم کے لیے سلطنت کے اعلیٰ ترین اتالیق مقرر کیے گئے تھے، جو ہمیں صَرف و نحو سے لے کر جغرافیہ اور ریاضی اور امورِ سیاست اور کاروبارِ ریاست پڑھاتے تھے۔ سہ پہر کے بعد تیر اندازی، شمشیر زنی اور گھڑ سواری کی تربیت دی جاتی تھی۔ دادا محترم اگر چہ مذہب کے بڑے پابند اور سخت گیر مشہور تھے، لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ علوم و فنون میں بھی دل چسپی رکھتے تھے۔ انھوں نے ہی دوسری زبانوں سے علمی کتابوں کو عربی میں منتقل کرنے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ وہ ہفتے میں ایک دو بار خود آ کر ہماری تعلیم و تربیت کا جائزہ لیا کرتے تھے اور اچھی کارکردگی دکھانے والے بچوں میں تحائف بانٹا کرتے تھے۔

لیکن اسی دوران اس وسیع مملکت کے کئی حصوں میں بدامنی پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ ایرانیوں کی سازشیں، علویوں کا فتنہ، بربروں کی شورش اور سب سے بڑھ کر عباسیوں کی ریشہ دوانیوں نے خلافت کی بنیادیں کھوکھلی کرنی شروع کر دی تھیں۔ جنت مکانی ہشام بن عبدالملک کے دور کے بعد تو جیسے فتنوں کے کواڑ کھل گئے۔ یکے بعد دیگرے میرے کئی چچا اقتدار میں آئے لیکن ان میں

سے بعض تو صرف چند ماہ ہی مسندِ خلافت پر فائز رہ پائے۔ میرے عم زاد اور دمشق کے آخری اموی خلیفہ مروان ثانی نے یوں تو کئی برس حکومت کی لیکن ان کے عہد میں عباسیوں نے خلافت کے مشرقی صوبے ہتھیانا شروع کر دیے تھے۔

اور پھر وہ دن آ گیا جو میری یادداشت میں پتھر کی لکیر کی طرح نقش ہو کر رہ گیا ہے۔ مجھے آج بھی ایسے لگتا ہے جیسے کل کی بات ہو۔ میں اس وقت انیس برس کا تھا اور اس دن رصافہ میں خیمے میں بیٹھا ہوا اپنے بیٹے کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ ہلکی ہلکی بارش کا سلسلہ جاری تھا۔ اچانک باہر سے شور وغل سنائی دیا۔ میں نے خیمے سے باہر نکل کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ شاہی گاؤں میں زبردست کھلبلی مچی ہوئی ہے۔ کچھ آگے گیا تو مجھے دشمن دستوں کے لہراتے ہوئے سیاہ پھریرے نظر آ گئے۔ اس اثنا میں میرا تیرہ سالہ بھائی یحیٰی دوڑتا ہوا میری طرف آیا، 'بھائی، بھاگو، یہ سیاہ پرچم بنو عباس کے ہیں۔' اگرچہ مجھے معلوم تھا کہ اقتدار کی ریت ہمارے خانوادے کے ہاتھوں سے پھسلتی چلی جا رہی ہے لیکن اختتام یوں یک لخت سر پر آ جائے گا، اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔

....

موٹر وے نما سڑک پر سفر کرتے ہوئے ایک بات متوجہ کرتی ہے کہ سڑک کے آس پاس بدہیت ہورڈنگ نظر نہیں آتے جن کی سستی اشتہاریت نے پاکستان کی شاہراہوں کے اطراف میں بکھرے حسن کو ایسے ڈھانپ لیا ہے جیسے پشاور میں بعض مولوی حضرات اشتہارات پر نظر آنے والے نسوانی خدوخال پر سیاہ رنگ پھیر دیتے ہیں۔ تاہم کبھی کبھی کسی ٹیلے پر، یا کسی موڑ پر ایک کالے رنگ کا بیل کی شکل میں کٹا ہوا بورڈ ضرور نظر آتا ہے، جس پر کوئی لفظ، کوئی عدد نہیں لکھا ہوتا۔ گائیڈ نے بتایا کہ کسی زمانے میں یہ ایک ہسپانوی شراب کے اشتہاری بورڈ تھے، لیکن پھر حکومت نے بل بورڈوں پر پابندی لگا دی، کیوں کہ اس کے خیال میں ان سے ڈرائیوروں کا دھیان بٹتا تھا۔ لیکن چوں کہ بیل بل فائیٹنگ کی وجہ سے سپین کی قومی علامت بن گیا ہے، اس لیے حکومت نے یہ بیل رہنے دیے، البتہ ان پر رقم عبارت پر سیاہ برش پھروا دیا۔

سڑک کے اطراف میں دیکھتے دیکھتے یکا یک ایک منظر نے چونکا کے رکھ دیا۔ ایک طرف سبز رنگ کے معلوماتی بورڈ پر خوش نما عربی خط میں شہروں کے نام اور فاصلے تحریر تھے۔ اور پھر یہ بورڈ جگہ جگہ نظر آنے لگے۔

یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

ڈان ہوان نے بتایا کہ اس علاقے سے مراکش جانے والے تارکینِ وطن اور سیاح بڑی تعداد میں گزرتے ہیں اور انھی کی سہولت کی خاطر اس علاقے میں عربی بورڈ نصب کیے گئے ہیں۔ بعد میں لوگوں سے بات چیت کے دوران معلوم ہوا کہ عربی جو سپین میں مردہ زبان بن گئی تھی، اب اس کا دوبارہ احیا ہونے لگا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ سپین میں شمالی افریقہ سے لاکھوں کی تعداد میں تارکین آ کر بس گئے ہیں۔ مزید یہ کہ یورپ کے دوسرے ملکوں سے شمالی افریقی سپین کے راستے سے اپنے ملکوں کو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ نئی ہسپانوی نسل میں عربی سیکھنے کا شوق بڑھتا جا رہا ہے اور جگہ جگہ عربی سیکھنے کے مرکز کھل گئے ہیں۔

راستے میں ایک جگہ رک کر کھانا کھایا گیا۔ میرے ہمراہی سیاحوں کی اکثریت کا تعلق لاطینی امریکہ سے تھا، کولمبیا، چلی، برازیل، ارجنٹینا۔ چوں کہ سپین نے ان ملکوں پر حکومت کی ہے اور ان لوگوں کی زبان بھی ہسپانوی ہی ہے، اس لیے انھیں سپین میں ایسی ہی کشش یا اپنایت محسوس ہوتی ہے جیسی برِصغیر کے لوگوں کو انگلستان جا کر۔ البتہ ایک عدد نوجوان مسلمان جوڑا بھی اس قافلے میں شامل تھا۔ عثمان کا تعلق لبنان سے تھا لیکن وہ ترکِ وطن کر کے آسٹریلیا جا بسے تھے، اور شین وارن کے لہجے میں انگریزی بولتے تھے۔ ان کی اہلیہ بھی عرب آسٹریلین تھیں۔ تعارف کے وقت جب لوگوں کو شک گزرا کہ شاید یہ شادی شدہ نہیں ہیں تو رافعہ نے نہ صرف مٹھی کھول کر انگوٹھی دکھا دی بلکہ فوراً پرس سے اپنے ایک سالہ بیٹے کی تصویر بھی نکال کر میز پر رکھ دی، جسے وہ اس کی دادی کی نگرانی میں میلبرن میں چھوڑ آئی تھی۔

میری خاص دوستی نیول اور ان کی بیگم سلویا سے ہوگئی، کیوں کہ یہ بس میں میرے سامنے والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ دونوں بھی آسٹریلوی تھے اور ریٹائر ہونے کے بعد اب جہاں گردی پر نکلے تھے، جس میں انھیں پانچ براعظموں کا سفر کرنا تھا۔ براعظم امریکہ کے طول و عرض میں گھومنے کے بعد یہ جوڑا پچھلے ہفتے ہی یورپ پہنچا تھا۔

یہاں بھی حلال کھانے کا مسئلہ درپیش ہوا۔ ایسے مواقع پر سبزی، مچھلی اور آلو کے قتلوں ہی پر اکتفا کرنا پڑتی ہے۔ میری فرمائش پر ارجنٹینا کی ایمیلیا نے ہسپانوی زبان میں چند کارآمد الفاظ لکھ کر دیے۔

مچھلی: پسکادو

آلو: پتاتا

سبزی: وَردوُرا

امیلیا سے بات چیت کے دوران میں نے کہا کہ میں ارجنٹینا میں ایک شخص کو جانتا ہوں، کہانی نویس خورخے بورخیس کو۔ وہ بے حد حیران ہوئیں کہ تمھیں تو ہسپانوی زبان نہیں آتی، پھر بورخیس کو کیسے پڑھ رکھا ہے۔ میں نے بتایا کہ بورخیس پاکستان کے ادبی حلقوں کا محبوب ادیب ہے۔ ویسے بات سوچنے والی ہے، کہاں لاطینی امریکہ اور کہاں اردو زبان، لیکن ادب نے ان قطبین کو ایک دھاگے میں باندھ رکھا ہے۔

....

سوچنے سمجھنے کا وقت نہیں تھا، میں خیمے کے اندر گیا، جلدی جلدی کچھ جواہر اور دینار لے کر پٹکے میں اڑسے، اپنے شیر خوار بیٹے کو اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور بھائی کے ساتھ بھاگتا ہوا وہاں سے نکل گیا۔ میری بہنیں اوپر مکان میں موجود تھیں، جاتے جاتے میں ان کو بتاتا گیا کہ میں مشرق کا رخ کر رہا ہوں اور مصر پہنچ کر انھیں اپنی خیریت کی اطلاع دوں گا۔ وہ چیختی چلاتی رہ گئیں۔

اس محشر کے عالم میں میرے ذہن میں یہی آیا کہ کسی طرح افریقیہ پہنچا جائے۔ بیچ میں ہزاروں میل کا فاصلہ حائل تھا اور میں جانتا تھا کہ اس سفر میں مجھے خون کے دریا عبور کرنا پڑیں گے، کیوں کہ آج کے واقعات سے ظاہر تھا کہ خلافتِ بنوامیہ کا چراغ گل ہو چکا ہے۔ ایسے میں صوبے دار اور عمال یوں وفاداریاں تبدیل کرتے ہیں جیسے صحرا کے ریتلے ٹیلے ہوا سے جگہ بدلتے رہتے ہیں۔

دور سے زخمیوں کی فریادیں سنائی دے رہی تھیں، جلتے ہوئے مکانوں اور خیموں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ عباسی خاص طور پر میری تلاش میں ہوں گے، کیوں کہ میں خلافت کے متوقع ولی عہدوں میں سے ایک تھا۔ ہم دیوار سے کود کر رصافہ کے عقب میں پہنچ گئے۔ شاہی اصطبل کی طرف جانے کا موقع نہیں تھا۔ ہم دیواروں اور درختوں کی اوٹ لیتے، لوگوں سے بچتے بچاتے بستی کی حدود سے نکل گئے۔

اسی دوران میرا وفادار ملازم بدر بھی ہمارے ساتھ ہولیا۔ اس نے بتایا کہ اموی خاندان کے

تمام مردوں اور لڑکوں کو چن چن کر موت کے گھاٹ اتارا جا چکا ہے، اور عباسی شکاری کتوں کی طرح میری تلاش میں ہیں۔ صورتِ حال کی سنگینی اب کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ کہاں چند لمحے قبل میں شاہی احاطے میں خوابوں خیالوں جیسی حسین زندگی بسر کر رہا تھا، اور اب یکا یک بنو امیہ کا واحد بالغ فرزند بچ جانے کے ناطے مجھے نہ صرف اپنی جان بچانی تھی، بلکہ ساتھ ہی ساتھ اپنے تیرہ سالہ بھائی اور کم سن بیٹے کی زندگیوں کی بھاری ذمے بھی مجھ پر عائد ہو گئی تھی۔

ہم بھاگتے بھاگتے فرات کے کنارے ایک مکان کے قریب پہنچے۔ گھر کا مالک مجھے جانتا تھا کیوں کہ میں اور میرے عم زاد شام کے وقت گھڑ سواری کرتے ہوئے اس علاقے سے اکثر گزرا کرتے تھے۔ اس نے ہمیں یوں بدحواسی کی حالت میں دیکھا تو بڑا حیران ہوا۔ میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ رقم لے کر ہمیں تین گھوڑے اور اشیائے خورد و نوش دے دے تا کہ ہم اپنا طویل سفر جاری رکھ سکیں۔ اس نے کہا کہ آپ بالکل فکر نہ کریں، میں بنو امیہ کا نمک خوار ہوں، میرے بس میں جو بھی ہو گا، آپ کی خاطر کروں گا۔

اس نے ہمیں اپنے گھر کے ایک کمرے میں بٹھا دیا اور خود اندر چلا گیا۔ اب اسے چھٹی حس کہیں یا کچھ اور کہ مجھے اس کا خلوص مصنوعی معلوم ہوا۔ میں نے دروازے کی درز سے آنکھ لگا کر دیکھا۔ وہ بیرونی دروازے پر کھڑا اپنے غلام کو کچھ ہدایات دے رہا تھا۔ غلام فوراً گھوڑے کو سرپٹ بھگا کر ہوا ہو گیا۔ میرا ماتھا ٹھنکا، میں نے بدر سے کہا کہ یہ شخص ناقابلِ اعتبار ہے اور اس نے انعام کے لالچ میں اپنے غلام کو مخبری کے لیے عباسیوں کے پاس بھیج دیا ہے۔

ہم فوراً اس غدار کے مکان سے نکل بھاگے، وہ بھی گھر سے باہر آ گیا اور ہمارے پیچھے پیچھے بھاگتے ہوئے مکارانہ لجاجت سے ہمیں رکنے کی صدائیں لگانے لگا۔ لیکن میں نے افق پر عباسی گھوڑوں کے سموں سے اٹھتی ہوئے گرد کے بادل دیکھ لیے تھے، اس لیے اپنے بیٹے کو اٹھائے اٹھائے، بھائی اور نوکر کے ساتھ درختوں کے ایک جھنڈ میں گھس گیا۔ اسی دوران ہمارے خون کا پیاسا عباسی دستہ اس شخص کے مکان تک پہنچ گیا۔ درختوں کے جھنڈ کے دوسری طرف دریائے فرات تھا، کل اور آج کی بارش کی وجہ سے دریا طغیانی پر آیا ہوا تھا اور اس کا مٹیالا پانی فراٹے لیتا ہوا بہہ رہا تھا۔

کوئی اور صورت نہیں تھی، میں نے بیٹے کو بازوؤں میں اٹھایا اور خدا کا نام لے کر پانی میں

چھلانگ لگا دی۔ بیٹا ڈر کے مارے میری گردن سے چمٹ گیا اور زور زور سے چلانے لگا۔ بدر نے یحییٰ کو سنبھالا لیکن پانی بہت جوش میں تھا، ان دونوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ غوطے کھانے لگے۔ اسی دوران عباسی دستہ دریا کے کنارے پر پہنچ گیا تھا۔ ان کے سردار نے آوازیں دینا شروع کر دیں، 'واپس آجاؤ، ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے، دریا طغیانی میں ہے، تم ڈوب جاؤ گے'۔

صاف ظاہر تھا کہ یہ عباسیوں کی چال ہے لیکن یحییٰ میرے اور بدر کے چیخنے چلانے کے باوجود غوطے کھاتے کھاتے کنارے پر آ گیا۔ میں نے دوسرے کنارے پر پہنچ کر دیکھا، درندوں نے میرے معصوم بھائی کی گردن اڑا کر اس کا سر نمک سے بھرے تھیلے میں ڈال لیا تھا تاکہ عباسیوں کے سرغنہ عبداللہ سفاح کو پیش کر کے بھاری انعام واکرام حاصل کیا جا سکے۔ میں اور بدر قریبی کھیتوں میں گھس گئے اور اس وقت تک بھاگتے رہے جب تک تھکن سے نڈھال ہو کر ڈھے نہیں گئے۔

....

اب پہاڑیاں چھدری ہو گئی تھیں۔ سڑک کے دائیں کنارے بورڈ پر لکھا ہوا نظر آیا:

قرطبہ 28

اشبیلیہ 165

مالقہ 201

اب سڑک کے اطراف سوکھے میدان شروع ہو گئے۔ بے آباد میدان۔ خال خال جھاڑیاں۔

لا مسکیتا ریستوران، سروس زون

قرطبہ 6

اشبیلیہ 143

مالقہ 179

کچھ ہی دیر بعد بس ایک وادی میں اترنے لگی۔ دور سے ایک مٹیالے دریا کے نشیب میں بکھرا ہوا سوادِ شہر ہویدا ہونے لگا۔ یہ قرطبہ ہے، جسے ایک زمانے میں دنیا کے ماتھے کا جھومر کہا جاتا تھا۔ دور سے قرطبہ کے آثار دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اور میں نے کھڑکی کے شیشے سے

نظریں جمادیں جیسے یہ منظر تھوڑی دیر میں غائب ہونے والا ہے۔

مسجدِ قرطبہ دریائے کبیر سے تھوڑی دور اونچائی پر تعمیر کی گئی ہے۔ بیرونی قلعہ نما سنگی دیوار سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ اس کے پیچھے عظیم مسجد واقع ہے۔طویل دیوار کے گرد گھوم کر ہم مالٹے کے درختوں سے بھرے صحن میں پہنچ گئے، جہاں ایک مقامی راہبر ہمارے لیے چشم بہ راہ تھا۔ سپین میں قانون یہ ہے کہ جہاں بھی جائیں، وہیں کے مقامی گائیڈ کی خدمات حاصل کرنا پڑتی ہیں۔ چناں چہ ایسے موقعوں پر ڈان ہوان صاحب ایک کونے میں کھڑے ہوکر سگریٹ سلگا لیتے تھے۔ نئے گائیڈ کی تقریر سنتے وقت ان کے چہرے سے ایک ایسا کھٹا میٹھا تاثر ٹپکتا تھا جیسے سٹیج پر بیٹھا ہوا جغادری شاعر کسی تک بند کے کلام پر سامعین کی بے محابا داد سن کر بیزاری سے کبھی شاعر کو اور کبھی سامعین کو دیکھتا ہے۔

تو آج میں اسی صحن میں یوں حیرت وحسرت کا مارا کھڑا تھا جیسے کوئی طویل سفر طے کرنے کے بعد کوئے جاناں تک پہنچے اور وہاں پہنچ کر ٹھٹک جائے، اور اس میں ایک قدم آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہو۔ رعب، دبدبے، بےکلی، اشتیاق اور تجسس جیسے ملے جلے جذبات کی خودرو بیلوں نے میرے پیروں سے لپٹ کر مجھے اپنی جگہ پر باندھ دیا۔

راہبر کے ٹہوکا دینے پر میں چونکا۔ وہ میری تلاش میں مسجد سے واپس آ گیا تھا۔ اس نے سرزنش کی کہ مسجد کے اندر بہت سے سیاح بھٹک جاتے ہیں اور نتیجتاً اپنی گاڑی سے رہ جاتے ہیں اس لیے مجھے زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

میں اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا مسجد کے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔

دروازے کے اندر قدم رکھا۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی، لیکن کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ میں بھڑکیلی دھوپ سے گزر کر اندر داخل ہوا تھا، اس لیے آنکھوں کو تاریکی سے راہ ورسم پیدا کرنے میں وقت لگ گیا۔ چند منٹوں کے انتظار کے بعد کہیں جا کر مسجد کے درودیوار نے گویا شرماتے، لجاتے ہوئے، دھیرے دھیرے اپنے چہرے سے اندھیرے کی نقاب سرکانا شروع کر دی۔

....

میری مرحومہ ماں راحہ کا تعلق بربر قبیلے نفیزہ سے تھا۔ اسی سے مجھے ورثے میں سرخ بال

ملے تھے، لیکن یہ بال اب میرے لیے وبال بن گئے تھے۔ ان کی وجہ سے مجھے دور سے پہچانا جا سکتا تھا۔ اوپر سے چھوٹے بچے کا ساتھ، جو ایک طرف تو میری شناخت کروا سکتا تھا دوسری طرف اس کی دیکھ بھال پلِ صراط پر چلنے کے مترادف تھی۔ اس کی ماں اسے جنم دینے کے کچھ ہی مہینوں بعد دنیا سے رخصت ہو گئی تھی لیکن رصافہ میں سینکڑوں کنیزیں اس کی خدمت پر مامور تھیں۔ مجھے یہ تک معلوم نہیں تھا کہ اس عمر کے بچے کیا کھاتے اور کیا پیتے ہیں۔ لیکن جاں نثار بدر سائے کی طرح میرے ساتھ تھا، اس نے ان معاملات میں میری رہنمائی کی، ورنہ اس کے بغیر ان کٹھن مراحل سے گزرنا ممکن نہیں تھا۔

رات ایک کھیت میں آدھے سوتے، آدھے جاگتے گزاری۔ ہر لمحے یہی دھڑکا تھا کہ عباسی اب پہنچے کہ تب پہنچے۔ صبح سویرے میں نے بدر کو کچھ رقم دے کر بھیجا کہ کہیں سے کھانے پینے کی چیزیں خرید لائے۔ اس نے واپس آتے آتے سہ پہر کر دی۔ خبر یہ تھی کہ میرے سر کی بھاری قیمت مقرر کر دی گئی ہے اور خوں خوار سپاہی ہر طرف میری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ تمام شاہراہوں پر مخبر بٹھا دیے گئے ہیں اور ہر سرائے میں ان کے جاسوس موجود ہیں۔

اگلے روز ہم نے ایک بار پھر مغرب کا سفر اختیار کیا۔ میں نے اپنے بال صافے میں چھپا لیے تھے۔ کسی بھی مصروف راستے سے سفر کرنا ناممکن ہو گیا تھا، اس لیے ہم چھوٹی بڑی گزرگاہوں سے پہلو بچاتے، بستیوں سے کنارہ کشی کرتے ہوئے، ویرانوں سے ہوتے ہوئے لشٹم پشٹم مغرب کی سمت چلتے رہے۔ دن کی روشنی ہمارے لیے جان لیوا ثابت ہو سکتی تھی، اس لیے ہم رات بھر پہاڑوں، دشتوں اور ویرانوں میں چلتے رہتے، اور پَو پھٹتے ہی کہیں اوٹ دیکھ کر پڑ رہتے۔ کسی آبادی کے آثار دکھائی دیتے تو بدر جا کر کھانے پینے کی چیزیں مانگ تانگ کر یا خرید لاتا۔ کئی دن کے بعد وہ ایک قصبے سے دو خچر خریدنے میں کامیاب ہو گیا، جس سے سفر میں سہولت پیدا ہو گئی۔

مصر کی سرزمین پر پہنچتے پہنچتے ہمیں چار ماہ لگ گئے۔ اسکندریہ کے باہر ایک خستہ حال سرائے میں رک کر میں نے بدر کو سن گن لینے کے لیے شہر بھیجا۔ اس نے واپس آ کر نہایت مایوس کن خبریں سنائیں۔ مصر کے صوبے دار کو اندازہ ہو گیا تھا کہ میں وہاں کا رخ کر سکتا ہوں، اس لیے اس نے پہرے داروں کو ہوشیار کر دیا تھا اور اس انتظار میں تھا کہ میں نظر آؤں تو میرا سر عباسی خلیفہ عبداللہ السفاح کو بھجوا کر بھاری مراعات حاصل کی جا سکیں۔

بدر نے بتایا کہ میری بہنیں بھی یہیں آئی ہوئی ہیں۔ میں نے رصافہ سے نکلتے وقت انھیں بتایا تھا کہ میں مصر کا رخ کروں گا۔ اگر چہ میرا شہر جانا بے حد مخدوش تھا، لیکن بہنوں سے ملنا بھی اتنا ہی ضروری تھا۔ میں نے اپنے بالوں میں خضاب لگا کر انھیں سیاہ کیا اور بدوؤں کا سا حلیہ بنا کر اس مکان پر پہنچ گیا تھا جہاں وہ ٹھہری ہوئی تھیں۔

بہنیں مجھے دیکھ کر دیر تک روتی رہیں۔ خانوادۂ بنوامیہ کا صفایا ہو چکا تھا اور ہماری 92 سالہ خلافت تتر بتر ہو چکی تھی۔ خونخوار عباسیوں نے امیہ خاندان کے دودھ پیتے بچوں تک کو نہیں بخشا تھا تا کہ ان میں سے کوئی بڑا ہو کر ان کے لیے خطرہ نہ بن سکے۔ السفاح، جس کے نام کا مطلب ہی خون ریز ہے، ہمارے خاندان کی دشمنی میں اس حد تک آگے چلا گیا تھا کہ اس نے میرے اجداد کی قبریں تک کھود کر ہڈیاں جلا کر راکھ کر ڈالی تھیں۔ تاہم عرب روایات کے تحت سفاح نے خواتین کو ضرر نہیں پہنچایا تھا اور انھیں اجازت تھی کہ وہ اپنی مرضی سے جہاں جانا چاہیں، جا سکتی ہیں۔

بہنوں سے مل کر میرا سینہ چھلنی ہو گیا تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ دل میں نئے سرے سے اس بات کی لگن پیدا ہو گئی تھی کہ مجھے ہر حال میں حوصلہ برقرار رکھنا ہے، اور اپنے بکھرے ہوئے خاندان کو مجتمع رکھنا ہے۔ خاندان کا واحد بچ جانے والا مرد ہونے کے باعث میرے کندھوں پر بنوامیہ کی وراثت کا بھاری بوجھ آ گیا تھا اور مجھے ہر حال میں اس امانت کا پاس رکھنا تھا۔

میں نے اپنا بیٹا بہنوں کے حوالے کیا اور بدر کو لے کر آگے چل پڑا۔

برقہ * کے صوبے دار عبدالرحمٰن ابنِ حبیب الفہری پر ہمارے خاندان نے خصوصی عنایات کی تھیں اور اسے گوشۂ گمنامی سے نکال کر برقہ جیسے متمول صوبے کا امیر تعینات کیا تھا۔ وہ امیر بننے سے پہلے دمشق میں دربارِ خلافت میں آیا کرتا تھا، جہاں وہ وقت بے وقت مرتے دم تک خاندانِ بنوامیہ کا ادنیٰ غلام بن کر رہنے کی قسمیں کھاتا رہتا تھا۔ ایک بار اس نے دربار میں میرے چچا سے کہا کہ کاش مجھے کوئی ایسا موقع ملے کہ میں اس خاندان کے احسان اتار سکوں۔

احسان اتارنے کا اس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا تھا؟ چناں میں بدر کو لے کر کشاں کشاں برقہ پہنچ گیا۔ لیکن میں جوں ہی اس کے دربار میں پہنچا، اس نے مجھے پہچانتے ہی اپنے محافظوں کو

* موجودہ لیبیا

اشارہ کر کے مجھے بیڑیاں پہنا دیں۔ میں نے کلمہ پڑھ لیا اور جلاد کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن ابنِ حبیب کے دل میں نہ جانے کیا آئی کہ اس نے جلاد سے پہلے ایک یہودی کاہن کو دربار میں بلا لیا اور اس سے پوچھا کہ تم نے کچھ عرصہ قبل ایک لڑکے کے بارے میں پیش گوئی کی تھی کہ وہ مستقبل کا عالی شان بادشاہ بنے گا، جلدی سے بتاؤ کہ کیا یہ وہی لڑکا ہے، تاکہ میں اس کا سر اڑا دوں۔ کاہن خاصی دیر تک میرے چہرے کو غور سے تکتا رہا، پھر اس نے اپنی کتابوں میں کچھ دیر تک حساب کتاب کیا۔ آخر اس نے ابنِ حبیب کو مخاطب کر کے ایک عجیب سی بات کہی:

> 'اگر تم اسے قتل کر دو گے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ وہ لڑکا نہیں ہے جس کے بارے میں میں نے پیشن گوئی کی تھی۔ اور اگر تم اسے چھوڑ دو گے، تو ممکن ہے کہ یہ وہی لڑکا ہو اور آگے چل کر ایک عظیم سلطنت کی بنیاد رکھے۔'

یہ سن کر ابنِ حبیب اس حد تک تذبذب کا شکار ہوا کہ اس کی فیصلہ کرنے کی صلاحیت مختلف ہوگئی۔ بہت دیر تک گومگو کی حالت میں رہنے کے بعد آخر اس نے مجھے آزاد کرنے کا حکم دے دیا۔

میں مسرت اور مایوسی کے ملے جلے جذبات دل میں لیے شہر سے باہر نکل آیا۔ قریب ہی ایک بربر قبیلے نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ اس قبیلے کے سردار ابوقرہ نے مجھے سراسیمگی کے عالم میں دیکھ کر شفقت کا برتاؤ کیا اور اونٹنی کا دودھ پینے کے لیے دیا۔ ابھی دودھ کا پیالہ میرے ہونٹوں سے ہٹا نہیں تھا کہ گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں۔ میں نے ابوقرہ کو بتا دیا کہ یہ میرے دشمن ہیں جو مجھے پکڑنے آئے ہیں۔ ابوقرہ کی مہربان بیوی تکفہ نے مجھے اپنے خیمے میں کپڑوں تلے چھپا دیا۔ تھوڑی دیر میں گھڑ سوار قبیلے کے اندر پہنچ گئے اور خیمہ خیمہ تلاشی لینے لگے۔ چند سپاہی اس خیمے کے اندر بھی آ گئے جہاں میں چھپا ہوا تھا لیکن تکفہ نے اس قدر شور مچایا کہ وہ سرسری طور پر ادھر ادھر دیکھ کر چل دیے۔ تکفہ اور ابوقرہ کا احسان میں زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔

....

آج مہینوں بعد مجھے ٹھیک ٹھیک بیان کرنے میں دقت پیش آ رہی ہے کہ اندھیرے کی دھند چھٹنے کے بعد میں نے کیا دیکھا۔ جب آپ کوئی عظیم ادبی شاہکار پہلی بار پڑھتے ہیں، کوئی معرکہ آرا سمفنی پہلی بار سنتے ہیں، کسی دیو قامت رہنما سے پہلی بار ملتے ہیں، تو ان لمحات کے جگنوؤں کو لفظوں کی مٹھی میں کیسے بند کر سکتے ہیں؟

شاید علامہ اقبال کو بھی یہی مسئلہ لاحق تھا کہ ان جیسے قادرالکلام شاعر نے بھی مسجدِ قرطبہ پر طویل نظم لکھتے ہوئے مسجد کے بارے صرف دو سطریں لکھی ہیں:

تیری بنا پائیدار، تیرے ستون بے شمار
شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجومِ نخیل

لیکن اقبال آخر اقبال ہیں، دو سطروں میں بھی بنیادی بات بیان کر گئے ہیں۔ واقعی سرخ اور سفید اینٹوں سے بنی ہوئی گھوڑے کی نعل کی شکل کی دہری محرابیں کندھوں پر اٹھائے پتھر سے تراشے ہوئے ستون سلطنتِ امیہ کے مرکزی صوبے شام کے کسی نخلستان کا سا منظر پیش کرتے ہیں۔ جہاں تک نظر جاتی ہے، انھی ستونوں کی فصل کھڑی نظر آتی ہے۔ مسجد کے کل ساڑھے بارہ سو ستون تھے، جو کلیسا کی تعمیر کے بعد ساڑھے آٹھ سو رہ گئے ہیں۔ دہری محرابیں صرف سجاوٹ کے لیے نہیں ہیں، بلکہ یہ بھاری چھت کا بوجھ اٹھانے کے لیے ضروری تھیں۔ محرابوں کا فانہ دو اجزا سے تعمیر کیا گیا ہے، سرخ اینٹوں اور سفید پتھر سے۔ کہا جاتا ہے کہ مسجد کے اولین معماروں نے محرابوں کا یہ انداز رومن آبی گزرگاہوں سے متاثر ہو کر اختیار کیا تھا اور اس قسم کی محرابوں کے آثار میریدا شہر کے قریب دیکھے جا سکتے ہیں۔ لیکن ایسی ہی محرابیں بنو امیہ کی دوسری تعمیرات میں بھی نظر آتی ہیں، خاص طور پر دمشق کی عظیم الشان مسجد جامع بنی امیہ الکبیر میں۔ آج یہ سرخ و سفید محرابیں مسجدِ قرطبہ کا مخصوص شناختی نشان بن گئی ہیں۔ سپین کے سفر کے دوران جگہ جگہ یہ محرابیں دکھائی دیں۔

....

برقہ کی زمین مجھ پر تنگ ہو چکی تھی۔ اس لیے میں وہاں سے نکل کر کئی مہینوں کے جاں گسل صحرائی سفر کے بعد بنی رستم کے علاقے تہارت پہنچ گیا۔ میں نے اپنا نام بدل لیا تھا اور اب میں غائف المنصور کے نام سے جانا جاتا تھا۔ تہارت میں مجھے خوش قسمتی سے مجھے اپنا ننھیالی قبیلہ نفیزہ مل گیا۔ انھوں نے میرا پرجوش خیر مقدم کیا اور میرے وہاں قیام کے دوران ہر ممکن سہولت اور آرام بہم پہنچایا۔ لیکن آرام کرنا میرے منصوبے میں شامل نہیں تھا۔ جوں ہی مجھے کسی حد تک سلامتی کا احساس ہوا، میں نے گھوم پھر کر آس پاس کے علاقوں میں بسے ہوئے بربر قبیلوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا، اور ان کے سرداروں سے رسم و راہ پیدا کرنا شروع کر دی۔ میرے بربر خون کا مجھے بہت فائدہ ہوا اور ہر جگہ سے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اب مجھے نام چھپانے کی بھی ضرورت نہیں تھی چناں چہ

میں نے اپنی اصل شناخت ظاہر کر دی۔

یہیں مجھے اندلس کے حالات و واقعات کا مطالعہ کرنے کا بھی موقع ملا۔ ویسے بھی مراکش اور اندلس کے درمیان صرف چند میل کی سمندری پٹی ہی حائل ہے، جہاں سے لوگ روزانہ آتے جاتے تھے۔ اندلس بری طرح سے اکھاڑ پچھاڑ کا شکار تھا۔ مسلمانوں کو طارق بن زیادہ کی فتح کے بعد وہاں اسلامی حکومت قائم کیے ہوئے 45 برس گزر چکے تھے، لیکن اس تمام عرصے میں حکمران اس قدر خلفشار کی حالت میں رہے کہ کسی امیر کو ایک سال گزارنا بھی مشکل سے نصیب ہوتا تھا، عرب بہ مقابلہ عرب، عرب بہ مقابلہ بربر اور بربر بہ مقابلہ بربر، غرض چومکھی جنگ جاری تھی۔ اندلس کے دو امیر السمح اور الغافقی بلادِ فرانسیہ میں لڑتے ہوئے مارے گئے تھے، جن کی وجہ سے یہ مملکت مزید انتشار میں گھر گئی تھی۔

اندلس کا امیر یوسف الفہری تھا، اسے بھی میرے دادا خلیفہ مروان نے یہاں کا امیر مقرر کیا تھا، لیکن جوں ہی اموی تخت الٹا گیا، اس نے السفاح سے وفاداری ظاہر کرنے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔ تاہم اس کے باوجود مجھے بتایا گیا کہ اندلس کے بہت سے مقامی صوبے دار اور عمال اب بھی بنوامیہ ہی کا دم بھرتے ہیں۔ ویسے بھی اندلس دمشق سے اتنی دور تھا کہ وہاں کی خبریں یہاں پہنچتے پہنچتے برسوں لگ جاتے تھے۔ یہاں کے لوگوں کے اپنے مسائل تھے، انھیں مرکزی خلافت کی آویزشوں اور چپقلشوں سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔

مزید برآں، بربروں کے ساتھ الفہری کا رویہ بہت خراب تھا۔ میں نے اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے کے لیے اندلس کے بربروں اور عربوں دونوں دھڑوں سے رابطے شروع کر دیے۔ اکثر امرا کی طرف سے مجھے حوصلہ افزا ردِعمل ملا۔ لیکن بہت سی باتیں فقط خط وکتابت سے طے نہیں ہوسکتی تھیں، اس لیے میں نے بدر کو اندلس بھیج دیا تاکہ وہ ان امرا کے ساتھ مذاکرات کر کے ان کے خیالات اور نیتیں جان سکے۔ میں نے اپنی شاہی مہر بھی بدر کو دے دی تھی تاکہ وہ باضابطہ طور پر میری طرف سے معاہدے کر سکے۔ مجھے خاص طور پر فوجی کمان دار ابوعثمان عبیداللہ کی حمایت کی سخت ضرورت تھی۔ اس کے آبا خلیفۂ ثالث اور میرے جدِ امجد حضرت عثمان بن عفان کی ملازمت میں رہ چکے تھے، اس لیے مجھے امید تھی کہ وہ میرا ساتھ دے گا۔

میں نے بدر کے انتظار میں بحیرۂ روم کے کنارے مغیلہ کے مقام پر ڈیرے ڈال دیے۔ اور

پھر وہ دن آ گیا جب مجھے اس کی کشتی کا پھڑ پھڑاتا ہوا سفید بادبان نظر آ گیا۔ وہ اکیلا نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ دو اندلسی سردار بھی تھے۔ ان دونوں نے مجھ سے درخواست کی کہ میں جلد از جلد اندلس پہنچ جاؤں، وہ میری ہر ممکن مدد کریں گے۔ دیر کرنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی اور ویسے بھی مجھے کوئی لمبی چوڑی تیاری نہیں کرنا تھی، اس لیے انھی کشتیوں میں بیٹھ کر سوئے اندلس چل پڑا۔

ہوا موافق تھی، ہماری کشتی ہوا کے زور پر بحیرۂ روم کے نیلے پانیوں پر سرزمینِ اندلس کی طرف گویا مقناطیسی کشش سے پھسلتی چلی گئی۔ دور سے مالقہ شہر کے آثار نظر آ رہے تھے۔ شہر کے دائیں بائیں پہاڑیاں درختوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ میں نے زیادہ تر عمر شام کے صحرائی میدانوں یا پھر افریقہ کے بے آب و گیاہ دشتوں میں گزاری تھی۔ رصافہ سے بھاگے ہوئے مجھے پانچ برس گزر چکے تھے، لیکن اس دوران ملنے والی صعوبتوں سے میری ہمت ماند پڑنے کی بجائے دل میں بھڑکتی آگ تیز تر ہو گئی تھی۔

میں چھوٹی سی کشتی میں بیٹھا اندلس کی جانب رواں دواں، عالمِ حیرت میں ادھر ادھر بکھرے قدرتی جلووں کو اپنی آنکھوں میں سموتا رہا۔ تاریخ کے پہیے نے مجھے زندگی کے فیصلہ کن موڑ تک پہنچا تو دیا تھا، لیکن اس سے آگے میری تقدیر میں کیا لکھا تھا، یہ میں نہیں جانتا تھا۔

....

مجھے معلوم تھا کہ مسجد کے بیچوں بیچ ایک گراں ڈیل کلیسا موجود ہے، لیکن مسجد کے دالان کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ اس کے اندر خاصی دیر تک گھومنے کے بعد بھی پتا نہیں چلتا کہ کلیسا کہاں ہے، کس طرف کو ہے، کدھر ہے۔

میرے گروپ کے علاوہ مسجد میں درجنوں سیاحوں کی ٹولیوں ستونوں کے جھنڈوں میں اپنے اپنے راہبروں کا دامن مستعدی سے تھامے ادھر سے ادھر یوں آ جا رہی تھیں جیسے چوزے مرغی کے پیچھے پیچھے گرتے پڑتے دوڑتے پھرتے ہیں۔ ہر طرف کیمروں کے فلیش ٹمٹما رہے تھے، اور بھانت بھانت کی بولیاں کانوں میں پڑ رہی تھیں، ہسپانوی، انگریزی، جاپانی، اطالوی، فرانسیسی، عربی۔

جب مسجد بنی تھی تو اس کے مہندسوں نے مٹی، چونے، پتھر، اور اینٹ گارے کے علاوہ تعمیر کا ایک عنصر روشنی بھی رکھا تھا جس کی موجیں مسجد کی دو منزلہ سفید و سرخ محرابوں، ستونوں اور چوبی

چھت پر نفیس نقش و نگار، اور فرش پر بچھے قالینوں کو شرابور کر کے ان کے رنگوں کو چمکا دیتی تھیں۔ اس بات کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ مسجد کی محرابوں پر سورۂ نور اور سورۂ نجم کی آیات بار بار دہرائی گئی ہیں۔ مسجد کے سامنے دیوار نہیں تھی اور نمازی صحن میں بنے حوض میں وضو بنا کر سیدھے مسجد میں داخل ہو جاتے تھے اور یوں صحن میں ایستادہ کھجور کا جھنڈ اور مسجد کے اندر پھیلا ہوا نخلستان ایک قالب ہو جایا کرتے تھے۔ لیکن عیسائیوں نے قرطبہ فتح کرنے کے بعد جہاں مسجد کے وسط میں کلیسا تعمیر کیا، وہیں صحن اور دالان کے درمیان موجود محرابوں کو پاٹ کر عمارت کو گھٹا ٹوپ تاریکیوں میں دھکیل دیا۔

....

ہم چند گھنٹوں کے اندر اندر مالقہ کے قریب واقع قصبے المونیکار پر اتر گئے۔ سورج ڈھل رہا تھا، میں نے کشتی سے اترتے ہی ساحل کی ریت پر نمازِ مغرب ادا کی۔ یہیں ابو عثمان اور اس کا داماد ابنِ خالد میرے استقبال کے لیے موجود تھے، انھوں نے میرے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

یہ سال 756ء کے بہار کا موسم تھا۔ ہر طرف اندلس کا قدرتی حسن جوبن پر تھا۔ میرے خدشات کے بادل رفتہ رفتہ چھٹنے لگے۔ راتوں رات مالقہ اور اس کے نواحی قصبوں اور دیہات میں میری آمد کی اطلاع برساتی ریلے کی سی سرعت سے پھیل گئی تھی۔ صبح سویرے ہی وفود آنا شروع ہو گئے جن کا ہر رکن میرے ہاتھ پر بیعت کرنے کا مشتاق تھا۔ کچھ ہی دیر بعد مراکش سے ایک ہزار بربر سپاہیوں پر مشتمل مسلح دستہ بھی آ پہنچا۔

چند دن مالقہ میں ٹھہر کر ہم نے قرطبہ کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ اس دوران میرے اردگرد ایک اچھا خاصا لشکر اکٹھا ہو گیا، جس سے ایک طرف تو میری حوصلہ افزائی ہوئی، لیکن دوسری طرف ان کے لیے خوراک اور رسد مہیا کرنے کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس مقصد کے لیے بھاری خزانے کی ضرورت تھی، جس سے ہم بالکل عاری تھے۔ اندلس گذشتہ کئی برسوں سے قحط سالی کی زد میں تھا جس سے خوراک میں مزید کمی واقع ہو گئی تھی۔ میرے سپاہی راستے میں جڑی بوٹیاں اور پتے ابال کر کھاتے رہے، لیکن ان کے جوش و جذبے میں کمی نہیں آئی۔

چند ہی دن بعد ہم اشبیلیہ پہنچ گئے۔ شہر کے دروازے کھول دیے گئے اور ہر طرف سے 'عبدالرحمٰن ابنِ معاویہ زندہ باد' کے نعرے سنائی دینے لگے۔ عورتوں نے چھتوں پر سے میرے اوپر

پھولوں کی پتیاں نچھاور کیں۔

میرے لشکر میں ہر لمحے اضافہ ہو رہا تھا اور ملک کے طول و عرض سے فوجی آ آ کر شامل ہو رہے تھے۔ لشکریوں کی روز افزوں تعداد سے رسد اور وسائل کا مسئلہ مزید شدت پکڑ گیا تھا۔ میں خود تمام لشکر میں گھوم پھر کر سپاہیوں کی ہمت کے ادھڑتے ہوئے دھاگے کو بُننے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔

اپنے کئی پیش روؤں کے برخلاف اندلس کا امیر یوسف الفہری خاصے عرصے سے اندلس کے تخت پر براجمان تھا اور مجھے معلوم تھا کہ وہ آسانی سے دست بردار نہیں ہوگا۔ ہم نے اشبیلیہ سے نکل کر دریائے الکبیر کے ساتھ ساتھ قرطبہ کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ جب ہم مسارہ کے قریب پہنچے تو جاسوسوں نے اطلاع دی کہ الفہری چند میل آگے اپنی فوج کے ساتھ خم ٹھونک کر مقابلے کے لیے تیار کھڑا ہوا ہے۔

....

عیسائی اور مسلم عمارتوں میں فرق کی وجہ غالباً تہذیبی تفاوت ہے۔ مسلم فنِ تعمیر میں وسعت، کشادگی اور فراخی کا پہلو بہت نمایاں ہوتا ہے، جس میں روشنی اور ہوا سے بھرپور استفادہ کیا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے پر کلیساؤں میں تنگی اور گھُٹن کا احساس ہوتا ہے۔ اور تو اور، گرجاؤں میں اکثر اوقات روشنی کو محض رنگین شیشوں کی بلند و بالا اور تنگ کھڑکیوں ہی سے چھن کر اندر آنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ یا پھر شاید اس کی وجہ موسمی فرق ہو۔ مسلمان تہذیب گرم علاقوں میں پھلی پھولی، جہاں کھلی اور ہوادار عمارتیں بنانا قدرتی تھا۔ اس کے مقابلے پر یورپ کے یخ بستہ موسم تنگ و تیرہ عمارتوں ہی کی اجازت دیتے ہوں گے۔

اسی تہذیبی آویزش کا خمیازہ مسجدِ قرطبہ کو بھگتنا پڑا ہے۔ لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ آج کے سیکولر سپین میں اس تاریخی غلطی کا ازالہ کر کے مسجد کو اس کا چھنا ہوا نور لوٹا دیا جائے؟

شاید نہیں، کیوں کہ مسجد کا انتظام و انصرام کلیسا کے کٹر پادریوں کے ہاتھ میں ہے۔ 2004ء میں قرطبہ میں بسنے والے مسلمانوں نے عیسائیوں کے مذہبی مرکز ویٹیکن سے درخواست کی تھی کہ انھیں مسجد میں نماز ادا کرنے کی اجازت دی جائے۔ لیکن ویٹیکن نے ٹکا سا جواب دیتے ہوئے اس عرضی کو مسترد کر دیا کہ یہ مسجد نہیں کلیسا ہے اور مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ تاریخ کو تسلیم کریں۔

....

الفہری کی فوج کیل کانٹے سے لیس تھی۔ان کے پاس خوراک کے بھی بے پناہ ذخیرے موجود تھے۔اس کے فوجی ہمارے سپاہیوں کی حالتِ زار سے خوب واقف تھے، وہ ہمارے لشکر کے عین سامنے قطاروں میں بکرے ذبح کرتے اور ہمارے فاقہ کش سپاہیوں کو دکھا دکھا کر ان کی بھنی ہوئی رانیں کھایا کرتے تھے۔

مئی کا وسط آ چکا تھا،عیدِ قرباں کا دن تھا کہ لڑائی کا آغاز ہوا۔اب تک کسی نے مجھے میدانِ جنگ میں لڑتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اس لیے مجھے علم تھا کہ کئی سرداروں کے دلوں میں میری حربی صلاحیتوں کی بابت شکوک وشبہات موج زن ہیں۔

ایک اندلسی امیر نے سواری کے لیے مجھے سفید رنگ کا شان دار عربی گھوڑا دیا تھا،لیکن جب میں اس پر سوار ہو کر لشکر کی صف بندی کا معائنہ کرنے نکلا تو سرگوشیاں سنائی دیں۔بعض یمنی سردار دبے دبے لہجے میں کہہ رہے تھے کہ میں نے یہ صبا رفتار گھوڑا اس لیے حاصل کیا ہے کہ اگر پسپائی اختیار کرنی پڑے تو میدانِ جنگ سے فرار ہونے میں سہولت ہو۔

لڑائی شروع ہونے سے عین پہلے سپہ سالار کے بارے میں اس قسم کی بدگمانیاں مہلک ثابت ہو سکتی تھیں۔ مجھے فوری طور پر ان کا سدِ باب کرنا تھا، چناں چہ میں گھوڑے کو ایڑ لگا کر یمنیوں کے سردار ابوالصباح کے پاس چلا گیا اور اس سے شکایتاً کہا، 'پتا نہیں یہ کس قسم کا گھوڑا ہے، کہ میرے قابو ہی میں نہیں آ رہا۔ایسا کرو کہ تم اسے لے لو، میں کوئی اور سواری دیکھتا ہوں۔' یہ کہہ کر میں گھوڑے سے اتر آیا اور اس کی باگیں ابوالصباح کو تھما دیں۔ اِدھر اُدھر دیکھا تو ایک مفلوک الحال سپاہی نظر آیا جو خود سے بھی زیادہ مفلوک الحال خچر پر سوار تھا۔ میں نے اس سے خچر لے لیا اور ایڑ لگا کر اپنے کیمپ کی طرف روانہ ہو گیا۔یمنیوں کے منھ کھلے کے کھلے رہ گئے تھے۔

....

مسجد کے اندر محافظ گھومتے رہتے ہیں اور اگر کوئی وہاں نماز پڑھنے کی کوشش کرے تو اسے روک دیتے ہیں۔انگریز مصنف جارج اورویل کی زبان میں ان کو 'نماز پولیس' کہا جا سکتا ہے۔ معلوم نہیں حضرت علامہ ان محافظوں کی آنکھ بچا کر کیسے نہ صرف نماز پڑھنے میں کامیاب ہو گئے بلکہ انھیں ایک عدد فوٹوگرافر بھی میسر آ گیا جس نے فٹافٹ تصویر بھی بنا لی! قیاس کہتا ہے کہ ۱۹۳۳ میں آج کی طرح کے برق رفتار کیمرے میسر نہیں ہوں گے اور تصویر لینے میں خاصا وقت لگ جاتا

ہوگا۔ یا پھر شاید اس زمانے میں اس پولیس کا وجود نہیں ہوگا۔

مسجد کے منتظمین اس کی سیر کے لیے مہنگے ٹکٹ بھی جاری کرتے ہیں، جن کے ساتھ ایک معلوماتی بروشر بھی دیا جاتا ہے۔ میں نے مسجد سے واپسی پر یہ بروشر دیکھا تو اس کا ایک ایک لفظ تعصب کی سیاہی سے لتھڑا ہوا پایا۔ بروشر کے سرورق پر مسجد کا کوئی منظر نہیں بلکہ اس کے اندر موجود کلیسا کی تصویر ہے۔ نیز بروشر کی پیشانی پر 'دی کیتھیڈرل آف کورڈوبا' لکھا ہوا ہے، حالاں کہ دنیا بھر میں، بشمول قرطبہ میں، اس عمارت کو مَسکیتا (Mesquita) یعنی مسجد کہا جاتا ہے۔ بروشر کے اندر جگہ جگہ قرطبہ کے مسلمان حکمرانوں کی مشہورِ زمانہ رواداری (Convivencia) کو بھی نشانہ بنایا گیا ہے۔*

مقامی راہبر نے بتایا کہ اپنے عروج کے زمانے میں یہ مسجد صرف نماز پڑھنے کے لیے مخصوص نہیں تھی، بلکہ بیک وقت کمیونٹی سنٹر، عدالت، کانفرنس ہال، آڈیٹوریم اور دانش گاہ کا درجہ رکھتی تھی۔ اس کے علاوہ مسجد ایک خیراتی ادارے کی حیثیت سے بھی کام کرتی تھی۔ یہاں حاجت مندوں کو مفت کھانا، اور مالی امداد ملتی تھی اور غریبوں کے کفن دفن کا بندوبست کیا جاتا تھا۔

ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو یورپ کی قدیم ترین یونیورسٹی آکسفرڈ یا یونیورسٹی آف پیرس نہیں، بلکہ مسجدِ قرطبہ ہے۔ نویں صدی عیسوی کے اندلسی شاعر ابنِ حزم نے بیان کیا ہے کہ مسجد کے اندر ہزاروں طلبا زیرِ تعلیم ہیں جنھیں صرف تفسیر، فقہ، یا حدیث ہی نہیں بلکہ عربی صرف ونحو، شعر و ادب، حتیٰ کہ زمانۂ جاہلیت کی شاعری جیسے مضامین تک پڑھائے جاتے ہیں۔

علم کی خوشبو کے ساتھ ساتھ یہاں اور خوشبوؤں یا روشنیوں کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ مغرب کی اذان سے پہلے ہی سینکڑوں فانوسوں میں شمعیں روشن کر دی جاتی تھیں، جب کہ رمضان کے مہینے میں محراب کے قریب ایک پچیس سیر وزنی موم بتی جلائی جاتی تھی جو تمام مہینے دن رات روشن

---

*ڈان ہوان صاحب قرطبہ ہی کے رہنے والے ہیں اور وہ بس میں سارا دن قرطبہ کی عظمت اور اس کے سیکیولر معاشرے کی عظمت کے گن گاتے رہے تھے۔ ان کی آواز میں اس وقت تاسف کی پرچھائیاں لہرانے لگی تھیں جب انھوں نے ذکر کیا تھا کہ قرطبہ دو صدیوں تک دنیا کا مرکز تھا اور آج جو مقام لندن، پیرس اور نیو یارک کو حاصل ہے، وہی مقام اس وقت قرطبہ کی جھولی میں تھا۔ میں نے بس میں واپس آنے کے بعد یہ بروشر دکھایا تو انھوں نے پادریوں کی تنگ نظری اور کوتاہ بینی کی شان میں بے نقط قصیدہ شروع کر دیا۔

رہتی تھی۔ تین سو خدام عنبرِ اسود اور صندل جلانے اور تین ہزار لالٹینوں میں خوشبودار تیل ڈالنے پر مامور تھے۔

مسجد کے تین اطراف میں دیواریں نہیں تھیں، اور مصروف سوق اور مسجد کا ماحول مدغم ہو جایا کرتے تھے۔ دینی اور دنیاوی کی تمیز مٹ جاتی تھی۔ مسجد کے باہر ایک طرف عوامی حمام تھے اور دوسری طرف وسیع و عریض بازار تھا، جس میں نہ صرف روزمرہ ضرورت کی تمام اشیا عبدالرحمٰن کی طرف سے مقرر کردہ نرخوں پر خریدی جاسکتی تھیں، بلکہ یہیں ایرانی قالین، دمشقی برتن، چینی ریشم، اور ہندوستانی مسالے دستیاب تھے۔ مسجد کے آس پاس عرب، بربر، مولدون (نومسلم ہسپانوی)، عیسائی، یہودی اکٹھے رہتے تھے۔

ابنِ خلدون نے لکھا ہے کہ اسلامی ملک ایک جاندار کی مانند ہوتا ہے۔ اسی مثال کو آگے بڑھا کر کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی شہر بھی ایک جسم کی مانند ہوتا ہے۔ شاہی محل اس کے دماغ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے کارواں سرائے اور کارخانے منھ اور نظامِ ہضم کا سا کام کرتے ہیں، جب کہ اس کے سکول اور مدرسے پھیپھڑوں کی مانند اسے تازہ آکسیجن فراہم کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اس جسم کا دل بہر حال مسجد ہی ہوتی ہے، جہاں سے روحانیت کا سرچشمہ پھوٹ کر پورے شہر کو سیراب کرتا رہتا ہے۔

میں سوچنے لگا کہ کسی زمانے میں اسی مسجد کے اندر کسی مخصوص ستون کے نیچے بیٹھ کر ابنِ رشد اپنے شاگردوں کو یونانی فلسفے کا درس دیتے ہوں گے، کسی اور ستون سے کمر ٹیک لگا کر ابنِ حزم اپنی کتاب 'طوقِ حمامہ' میں سے کوئی پھڑکتی ہوئی نظم سامعین کے گوش گزار کرتے ہوں گے تو کسی قریبی جھنڈ میں بغداد کے مدینۃ الحکمہ سے آنے والی کسی تہلکہ خیز کتاب کا احوال بیان کیا جا رہا ہو گا۔ اور یہیں کسی ستون کے نیچے ابن العربی متحیر پرستاروں کے گھیرے میں اپنی روحانی وارداتوں کا احوال بیان کرتے ہوں گے۔ کیا عجب کسی ستون کے تنے پر اب تک ان کی انگلیوں کے نشان پائے جاتے ہوں؟

....

جنگ کا طبل بجا۔ میں اپنا خچر سب سے اگلی صف میں لے گیا۔ یلغار کے وقت میں پہلی قطار میں پیش پیش تھا، تاکہ اگر کسی کو میری جنگی مہارت پر شک ہے تو وہ زائل ہو جائے۔ الفہری کا سپہ

سالار ابو صمیل بڑی بے جگری سے لڑا، لیکن ہماری فوج کے زبردست جذبے کے سامنے اس کی پیش نہ گئی۔ شام ہوتے ہوتے ہماری شاندار فتح مکمل ہو چکی تھی۔ الفہر ی کی فوج ایسی تتر بتر ہوئی کہ جس سردار کا جدھر منہ اٹھا، وہ ادھر کو بھاگ کھڑا ہوا۔ خود الفہر ی چند فوجیوں کے ساتھ میریدا کی طرف فرار ہو گیا۔

اب میرے لیے اندلس کے دارالحکومت قرطبہ میں فاتحانہ شان سے داخل ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہ گئی تھی۔ تاہم میں نے فصیلِ شہر کے باہر ڈیرے ڈال دیے اور تین دن تک اپنے لشکر کے ساتھ وہیں مقیم رہا تا کہ الفہر ی کے خاندان کی خواتین آرام سے وہاں سے نکل جائیں۔ اس کے علاوہ میں نے تمام دشمن سپاہیوں کے لیے مکمل معافی کا اعلان بھی کیا۔

قرطبہ کی عنانِ اقتدار سنبھالنے کے بعد بھی مسائل کم نہیں ہوئے اور ابو صمیل اور الفہر ی کی طرف سے شورش کا سلسلہ جاری رہا، لیکن اب تاریخ کا دھارا میرے حق میں مڑ چکا تھا، اور یہ فتنے میرے لیے معمولی دردِ سر سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ میرے جرنیلوں نے یکے بعد دیگرے تمام باغیوں کا صفایا کر دیا۔

ادھر جب عباسیوں کو میری کامیابیوں کی خبر ملی تو انھیں سخت تشویش لاحق ہو گئی۔ السفاح کے بعد تخت سنبھالنے والے خلیفہ ابو جعفر المنصو ر نے شمالی افریقہ کے والی ابنِ مغیث کو لکھا کہ وہ میری سرکوبی کے لیے ایک بحری بیڑا لے کر فوراً اندلس پر دھاوا بول دے تا کہ اسے بھی عباسی خلافت میں شامل کیا جا سکے۔ ابن مغیث نے 763ء میں ایک بڑی فوج اکٹھی کی اور اندلس پر چڑھ دوڑا۔

لیکن اب میں وہ بے یارو مددگار مفرور نہیں تھا جو عباسیوں کے ڈر سے زمین کے طول وعرض میں چھپتا پھرتا تھا۔ اب میں ایک بڑی سلطنت کا حکمران تھا، عباسی ایک بار تو کامیاب ہو گئے تھے لیکن اب وہ مجھ سے اتنی آسانی سے یہ سب کچھ نہیں چھین سکتے تھے۔ جب ابو مغیث کی فوج اشبیلیہ کے قریب خیمہ زن ہوئی تو میرے دستوں نے اس پر ایسا بھرپور شب خون مارا کہ انھیں سنبھلنے کا موقع نہیں مل سکا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تمام جارح فوج کا صفایا کر دیا گیا۔ مرنے والوں میں خود ابو مغیث اور اس کے تمام سرکردہ سردار شامل تھے۔ اب میں نے فیصلہ کیا کہ عباسیوں کو انھی کی زبان میں جواب دیا جائے۔ میں نے ان تمام سرداروں کے سر نمک لگوا کر اور سیاہ عباسی پرچموں میں لپیٹ کر مکہ بھجوا دیے جہاں عباسی خلیفہ المنصو ر حج کرنے کے لیے گیا ہوا تھا۔

مجھے بتایا گیا کہ جب المنصور نے یہ سر دیکھے تو وہ تھرّا اٹھا اور اس کے منہ سے نکلا، 'شکر ہے اس خدا کا جس نے ہمارے درمیان سمندر حائل کر رکھا ہے۔' منصور ہی نے مجھے 'صقرِ قریش'، یعنی 'قریش کا عقاب' کا خطاب دیا تھا۔ اس بات کی روایت بھی بڑی دلچسپ ہے:

> منصور نے ایک بار اپنے درباریوں سے پوچھا کہ وہ کون ہے جو 'صقرِ قریش' لقب کا سب سے زیادہ حق دار ہے؟ درباریوں نے یک زبان ہو کر کہا، 'یا امیر المومنین، آپ۔' خلیفہ نے نفی میں سر ہلایا۔ درباریوں نے کہا، 'معاویہ بن ابی سفیان۔' خلیفہ نے پھر سر ہلا دیا۔ درباریوں نے کہا، 'عبدالملک ابن مروان۔' لیکن خلیفہ نے پھر سر ہلا دیا۔

آخر خلیفہ نے خود جواب دیا:

> 'صقرِ قریش' لقب کا سب سے زیادہ مستحق عبدالرحمٰن ہے، جو اپنی ذہانت اور فراست کی بنا پر نیزوں کی انیوں اور تلواروں کی دھاروں سے بچ نکلا۔ وہ عبدالرحمٰن جو شام و فلسطین و افریقیہ کے لق و دق صحراؤں اور ان جانی ان دیکھی سرزمینوں میں تنِ تنہا بھٹکتا رہا۔ وہ عبدالرحمٰن جس نے کسی لاؤ لشکر، کسی سہارے، کسی خزانے کے بغیر صرف اپنی جرات اور بہادری کے بل بوتے پر اپنی قسمت خود تحریر کی۔ اس کے پاس صرف اپنی ہمت کا ہتھیار تھا، جس سے اس نے اپنے مغرور دشمنوں کا سر نیچا کیا، باغیوں کا صفایا کیا، شہر آباد کیے، اپنے پرچم تلے لشکر منظم کیے، اور ایک ایسے ملک میں عالی شان سلطنت قائم کی جو مسلسل خلفشار کا شکار تھا۔ یہ کام انسانی تاریخ میں اس سے پہلے کوئی نہیں کر سکا۔ معاویہ عمر بن خطاب اور اپنے چچا زاد بھائی عثمان بن عفان کی سرپرستی سے اپنے مرتبے پر پہنچے، عبدالملک کا تو پورا خانوادہ حکمران تھا۔ جہاں تک تمہارے امیر المومنین کی بات ہے تو وہ بھی آج اس مقام پر اپنے خاندان کی تگ و دو اور حامیوں کی حمایت کی وجہ سے ہیں۔ لیکن عبدالرحمٰن نے یہ سب کچھ تنِ تنہا کیا۔

....

عبدالرحمٰن اول نے مسجد کی تعمیر کا کام اپنی زندگی کے آخری برسوں میں شروع کیا تھا۔ گویا وہ اپنی ساری زندگی کی جدو جہد کا نچوڑ اس مسجد کی شکل میں دنیا کو دکھانا چاہتا تھا۔ جس طرح پردیسی شہزادہ اپنے محل میں کھجور کا درخت لگا کر اس سے وطن بدری کا دکھ بانٹتا تھا، ویسے ہی اس نے مسجد کی تعمیر میں شام کی ہمیشہ کے لیے گم گشتہ یادوں اور چھنی ہوئی اموی روایت کی بازیافت کی کوشش کی ہے۔

بازیافت کی یہ کوشش اس حد تک چلی گئی ہے کہ مسجد کا قبلہ تک درست نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ معماروں نے غلطی سے قبلہ اسی طرف رکھا جس طرف دمشق کی اموی مسجد کا قبلہ تھا، حالاں کہ یہاں قبلہ جنوب مشرق کی طرف ہونا چاہیئے تھا۔

مسجدِ قرطبہ کی تاریخ خود اس کے در و دیوار پر رقم ہے۔ کسی کو سپین کی دو ہزار سالہ تاریخ اپنی آنکھوں سے دیکھنی ہو تو اسے اس مسجد کی شکل میں دیکھ سکتا ہے۔ مسجد کے مقام پر رومیوں کا معبد تھا، جب عیسائی وزی گوتھ قرطبہ کے حکمران بن گئے تو انھوں نے معبد ڈھا کر اس کی جگہ کلیسا تعمیر کیا جو سینٹ ونسٹ کا کلیسا کہلاتا تھا۔ عبدالرحمٰن نے کلیسا کے پادریوں سے 80 ہزار درہم میں کلیسا خرید کر اس پر مسجد کی بنیاد رکھی۔ بعد میں اس کے جانشین حسب توفیق مسجد میں توسیع کرتے رہے۔ حتیٰ کہ جب 1236ء میں قرطبہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا تو اسے بپتسمہ دے کر گرجا قرار دے دیا گیا۔ پھر جب سپین میں کیتھولک مذہبی جنون اپنی انتہا کو پہنچا تو نہ صرف مسلمانوں کو کان سے پکڑ کر ملک سے نکال باہر کر دیا گیا بلکہ مسجد کی چھاتی میں بھی ایک کلیسا خنجر کی طرح گاڑ دیا گیا۔

عبدالرحمٰن اس مسجد کی شکل میں اپنا دستخط روئے زمین پر چھوڑنا چاہتا تھا۔ اس نے یقیناً اس کے نقشے پر کافی غور و خوض کیا ہوگا۔ اس نے دمشق میں اپنے دادا ہشام کے بھائی خلیفہ الولید کی تعمیر عظیم مسجد بھی دیکھی تھی، اور یروشلم میں واقع قبۃ الصخرہ (ڈوم آف دا راک) بھی، جو اسلامی تعمیر کے اولین نمونوں میں سے ایک ہے۔ عبدالرحمٰن اور اس کے مہندسوں نے ان دونوں مساجد سے استفادہ بھی کیا ہے اور ان کے آرٹ کو کئی قدم آگے بھی بڑھایا ہے۔

مسجدِ قرطبہ کی دہری محرابیں دمشق کی مسجد کی یاد دلاتی ہیں، تاہم زیریں محرابوں کی ساخت اور بُنت قرطبی معماروں کی تخلیق ہے، جو دنیا میں اور کہیں نظر نہیں آتی۔ مسجد کی تعمیراتی جدت یہ ہے کہ اس میں چھت اونچی کرنے کے لیے دہری محرابیں استعمال کی گئی ہیں۔ اس کا ایک اور عملی فائدہ

یہ ہے کہ واحد محراب بھاری چھت کا بوجھ اٹھانے سے قاصر تھی، لیکن دہری محرابیں یہ فریضہ اب تک بڑی خوش اسلوبی سے نبھا رہی ہیں۔ اوپری محراب نچلی کی نسبت زیادہ بڑی ہے اور ان دونوں کا بوجھ پتلے اور نازک اندام ستونوں کی قطاروں پر ہے۔

مسجد کی تعمیر میں رومی کھنڈرات سے نکالے گئے ستون اور محرابیں استعمال کی گئیں، اور مسجد کی مرکزی محراب بنانے کے لیے قسطنطنیہ کے عیسائی بادشاہ نے کاریگر اور پچی کاری کا سامان بھیجا، لیکن اس کے باوجود مسجد بنیادی طور پر اموی طرزِ تعمیر کا نمونہ ہے۔

مسجد کی محرابوں میں سفید اور سرخ اینٹیں لگائی گئی ہیں جن کی دھاریاں مسجد کے مجموعی نقشے سے یوں ہم آہنگ ہو جاتی ہیں، جیسے سنگِ مرمر، سنگِ خارا اور سنگِ مردار سے بنے ہوئے سڈول ستون شانوں پر قوسِ قزح اٹھائے ہوئے ہوں۔

ایک اور جدت مقصورہ کے گنبد کی ساخت میں روا رکھی گئی ہے، جو مشرق و مغرب میں اور کہیں نظر نہیں آتی۔ مہندسوں کو یہ مسئلہ درپیش تھا کہ گول گنبد کو کیسے مربع دیواروں کے ساتھ مربوط کیا جائے کہ گنبد کی گولائی بہ تدریج دیواروں میں ضم ہو جائے جو دیکھنے میں بھی خوش نما لگے اور انجینیئر نگ کے تقاضوں کے بھی مطابق ہو۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے ایک ہشت پہلو شکل دریافت کی جو رفتہ رفتہ گنبد میں مدغم ہو جاتی ہے اور دیکھنے میں بھی بے حد حسین و جمیل لگتی ہے۔ آرٹ اور فنکشن کا اس سے عمدہ امتزاج ڈھونڈنا مشکل ہے۔

مسجد کی سب سے خاص بات اس کے قطار اندر قطار ستون ہیں۔ جدھر دیکھو، حدِ نگاہ تک ستونوں کا جنگل دکھائی دیتا ہے اور مشرق، مغرب، شمال، جنوب کا احساس مٹ جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے انسان کسی شیش محل کے اندر پہنچ گیا ہے جہاں ہر طرف لامتناہی عکس در عکس کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ شاید لامتناہیت کا یہی تاثر پیدا کرنا مسجد کے معماروں کے مدِ نظر رہا ہو کہ انسان یہاں دنیا بلکہ اپنے آپ تک کو بھلا کر قادرِ مطلق کی لامتناہیت کے سامنے سربسجود ہو جائے۔

....

دشمنوں کی طرف سے اطمینان ہونے کے بعد میں نے اپنی توجہ انتظامی اور ریاستی امور پر مرکوز کر دیں اور ان تمام مسائل کو حل کرنے کی بھرپور کوشش کی جن کی وجہ سے اندلس اتنے عرصے سے بدنظمی کا شکار تھا۔ اموی خلافت میں امورِ سلطنت کی تربیت اس سلسلے میں بہت کام آئی۔ میں

نے ملک کے طول وعرض میں سڑکیں بنوائیں، نہریں نکلوائیں اور قرطبہ کے قریب جو رومی آب ریز نہریں شکست وریخت کا شکار ہو چکی تھیں، ان کی مرمت کروائی۔

تمام اسلامی دنیا کی خلافت نہ سہی، دمشق میں رصافہ کے محلات نہ سہی، لیکن میں بنوامیہ کی راکھ سے سرزمینِ یورپ پر ایک نئی اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے بیٹے سلیمان کو قرطبہ بلا لیا تھا، لیکن میری بہنیں اتنا طویل سفر نہیں کر سکیں اور میں انھیں دوبارہ دیکھنے سے محروم رہا۔ تاہم ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ تمام اسلامی دنیا سے اموی خاندان کے افراد، وفاداروں اور ہم دردوں نے جوق در جوق اندلس کا رخ کرنا شروع کر دیا، جن سے مجھے میرے کاروبارِ سلطنت میں بہت مدد ملی۔ لیکن پھر بھی کبھی کبھار وطن کی یاد ستاتی تھی، اور میں شاعری کے ذریعے دل کا غبار کسی حد تک دور کر لیا کرتا تھا۔

....

مسجد کی محراب بھی دنیا بھر کے طرزِ تعمیر کے اعلیٰ ترین فن پاروں میں سے ایک ہے۔ یہی وہ سانچہ ہے جس کے نمونے پر بعد میں آنے والی صدیوں میں دنیا بھر کی مسجدوں میں محرابیں تعمیر کی گئیں۔ یہ محراب عبدالرحمٰن کے بیٹے ہشام نے تعمیر کروائی تھی۔ اندلس میں اموی خلافت کے آخری دور میں طاقت ور وزیر المنصور نے مسجد کی توسیع کی۔ اس نے شمال میں واقع عیسائیوں کے انتہائی مقدس مقام سینتیاگو کا مپوستیلا کو فتح کر کے وہاں کے بڑے کلیسا سے گھنٹیاں اتروا لیں اور انھیں عیسائی زائرین کے کندھوں پر لدوا کر قرطبہ لے آیا اور انھیں شمع دان بنوا کر مسجدِ قرطبہ میں نصب کروا دیا۔ جب 1236ء میں عیسائی حکمران فرڈیننڈ ثالث نے قرطبہ فتح کیا تو اس نے مسجد سے گھنٹیاں اتروا کر مسلمانوں کے کندھوں پر سوار کروا کر واپس سینتیاگو بھجوا دیں۔

فرڈیننڈ نے مسجد کو نہیں چھیڑا، تاہم 1523ء میں کارلوس پنجم نے مسجد کے بیچوں بیچ کلیسا بنانے کا حکم صادر کر دیا۔ اس مقصد کے لیے 63 ستون مسمار کر دیے گئے۔ مشہور ہے کہ جب کارلوس نے مکمل شدہ کلیسا دیکھا تو غم و غصے سے چلا اٹھا اور کہنے لگا کہ جو تم نے بنایا ہے وہ کہیں بھی بنایا جا سکتا تھا، لیکن تم نے جو توڑا ہے وہ دنیا میں اس کا کوئی مثل نہیں تھا۔ ہمیں اس روایت پر یقین کرنے میں ذرا مشکل پیش آ رہی ہے، کیوں کہ اسی کارلوس نے بعد میں الحمرا کے ایک حصے کو منہدم کروا کر وہاں اپنا گراں ڈیل محل تعمیر کروایا، جو الحمرا کے بیچ ٹاٹ کا پیوند لگتا ہے۔ لیکن اس کا ذکر ذرا

بعد میں۔

مسجد میں چلتے چلتے ہم ایک دیوار کے قریب پہنچے جہاں ایسی ٹائلیں نصب کی گئی ہیں جن پر معماروں نے اپنے اپنے نام کچے پلاسٹر پر لکھے ہیں۔ یہاں ہر طرح کے اسلامی نام نظر آتے ہیں، قاسم، احسان، مسعود۔ میں خاصی دیر تک اس دیوار کے آگے کھڑا ان ناموں کو تکتا اور ان معماروں کے بارے میں سوچتا رہا۔

آخر ہمارا راہبر ہمارے گروپ کو ہنکا کر مرکزی کلیسا کی طرف لے گیا۔ میں یقین سے کہہ نہیں سکتا کہ یہ میرا ذاتی تعصب ہے یا کچھ اور، لیکن مجھے مسجد کے پراسرار، گہرے اور گمبھیر حسن کے اندر یہ شوخ وشنگ اور زرق برق کلیسا ایک آنکھ نہیں بھایا۔ ایسا لگا جیسے کسی نے خاموش، پرسکون ہال میں اچانک تیز موسیقی چھیڑ دی ہو۔ لیکن خیر، ایک لحاظ سے کلیسا کا احسان مند بھی ہونا ناگزیر ہے۔ اگر مسجد کے بیچ میں یہ کلیسا نہ ہوتا تو مسجد بھی قائم نہ رہ پاتی۔ قرطبہ میں ہزار سے اوپر مسجدیں تھیں، ان میں سے صرف یہی باقی بچی ہے۔

ہم جب کلیسا میں پہنچے تو وہاں عبادت کے لیے آنے والوں کا ہجوم اکٹھا ہو رہا تھا، اور لوگ لکڑی کی لمبی بینچوں پر بیٹھے وعظ شروع ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ اس موقعے پر راہبر ہمیں خاموش رہنے کی تلقین کرتا ہوا مسجد کی بیرونی دیوار کی طرف لے گیا۔ وہاں اس نے اسلامی معاشرے میں مسجد کی اہمیت اور مرکزیت پر اپنا وعظ شروع کر دیا۔ اس نے سامعین کے علم میں اضافہ کرتے ہوئے بتایا کہ ابتدا میں اسلام کا قبلہ یروشلم کی طرف تھا لیکن بعد میں اسے مکہ کی طرف موڑ دیا گیا۔ اس موقعے پر لبنانی رافعہ بول پڑی کہ ہاں، اس لیے کہ وہاں پیغمبرِ اسلام دفن ہیں۔ اسے ٹوکنا ضروری تھا، اس لیے میں نے کہا کہ ایک تو قبلے کا حضور پاک کے روضہ مبارک سے کوئی تعلق نہیں ہے، دوسری بات یہ کہ ان کا روضہ مکے میں نہیں بلکہ مدینے میں ہے۔ اس کا خاوند اس بات سے تھوڑا کھسیانا ہو گیا اور بیوی سے مخاطب ہو کر کہنے لگا، 'تم نے مجھے بھی سب کے سامنے شرمندہ کر دیا ہے۔ جس بات کا پتا نہ ہوا سے لوگوں کے سامنے مت بیان کیا کرو۔'

مسجدِ قرطبہ جہاں ایک طرف مسلمانوں کے عروج کا مرقع ہے، وہیں اس کے در و دیوار ان کے زوال کی داستان بھی بیان کرتے ہیں۔ اس لیے مسجد سے واپسی پر بہت دیر تک دل کے افق پر پچھتاوے کے بادل چھائے رہتے ہیں۔

....

میں نے دمشق کے باہر رصافہ کے محلات کی طرز پر قرطبہ سے باہر رصافہ ہی کے نام سے محل بنوایا اور اس میں شام کی یاد میں کھجور کے درخت لگوائے۔ انھی میں سے ایک درخت کو دیکھ میں نے نظم لکھی تھی:

میرے باغ کے بیچوں بیچ
ایک کھجور کا درخت ہے
جو اپنے وطن سے دور
مغرب کی مٹی میں ایستادہ ہے

اسے دیکھ کر میرے منھ سے نکلا
تم میری مانند ہو
تم مجھ جیسے ہو
مسافتوں کی دھول پھانکنے میں
دشت نوردیوں میں
اپنے پرایوں سے بچھڑنے میں

میری طرح
تم بھی پردیسی مٹی میں اگے ہو
میری طرح
تم بھی اپنے وطن سے ہزاروں کوس دور ہو

میری دعا ہے کہ صبح کے بارآور بادل
تمہاری جڑوں کو پانی دیتے رہیں
میری دعا ہے کہ رسیلی بارشیں

تم سے کبھی منھ نہ موڑیں

....

علامہ اقبال نے بھی اس نظم کا ترجمہ 'عبدالرحمٰن اول کا بویا ہوا کھجور کا پہلا درخت سرزمینِ اندلس میں' کے نام سے کیا ہے جو بالِ جبریل میں شامل ہے۔ تاہم انھوں نے آخر میں ایک بند اپنی طرف سے بڑھا دیا ہے۔

میری آنکھوں کا نور ہے تو
میرے دل کا سرور ہے تو
اپنی وادی سے دور ہوں میں
میرے لیے نخلِ طور ہے تو
مغرب کی ہوا نے تجھ کو پالا
صحرائے عرب کی حور ہے تو
پردیس میں ناصبور ہوں میں
پردیس میں ناصبور ہے تو
غربت کی ہوا میں بارور ہو
ساقی ترا نمِ سحر ہو
عالم کا عجب ہے نظارہ
دامانِ نگہ ہے پارہ پارہ
ہمت کو شناوری مبارک
پیدا نہیں بحر کا کنارہ
ہے سوزِ دروں سے زندگانی
اٹھتا نہیں خاک سے شرارہ
صبحِ غربت میں اور چمکا
ٹوٹا ہوا شام کا ستارہ
مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے
مومن کا مقام ہر کہیں ہے

اندلس کا طوطی ہزار داستان

خلیفہ المومنین ہارون رشید نے اپنی چمکیلی سیاہ آنکھیں مجھ پر مرکوز کر دیں: 'زریاب، تم نے اپنے استاد موسیقارِ اعلیٰ اسحٰق بن ابراہیم موصلی سے فنِ موسیقی میں اب تک کیا سیکھا ہے؟'

میں اس طرح براہِ راست مخاطب کیے جانے پر چونک گیا اور ایک ثانیے کو اوپر دیکھ کر نظریں دوبارہ اپنے پیروں کے انگوٹھوں پر جما دیں۔

'خلیفہ المومنین، میں نے کوشش کی ہے کہ میرے شوق اور لگن کی سرزمین استادِ عالی مقام کے بارانِ فیض سے بساط بھر سیراب ہو سکے۔'

'بہت خوب، تو پھر دیر کس بات کی ہے۔ ہم مشتاق ہیں کہ تم سے کوئی سریلا نغمہ سنیں۔'

عباسی دربارِ دُربار میں اس وقت شاہی موسیقار اسحٰق موصلی، وزیر جعفر برمکی، ملک الشعرا ابونواس اور چند دوسرے امرا بھی موجود تھے۔ خلیفہ کی بات سن کر وہ بھی ہمہ تن گوش ہو گئے۔

'اے خلیفۂ وقت، جو دوسرے گلوگار گا سکتے ہیں، وہ میں بھی گا سکتا ہوں، لیکن میرے پاس کچھ دھنیں ایسی بھی ہیں، جو میں نے پہلے کسی کو نہیں سنائیں۔ وہ صرف دربارِ خلافت ہی میں زیب دیتی ہیں۔'

اس بات سے خلیفہ کا اشتیاق بڑھ گیا۔ انھوں نے استاد اسحٰق سے کہا، 'اسحٰق اپنا عود زریاب کو دے دو تاکہ ذرا ہم بھی سنیں وہ کون سی دھنیں ہیں جو اس نوجوان نے اپنے سینے میں چھپا کر رکھی ہیں۔'

میں نے نظریں نیچی ہی رکھیں۔ 'اگر خلیفہ المومنین چاہتے ہیں کہ میں استاد کے انداز میں گاؤں تو میں ان کا عود بجا سکتا ہوں۔ لیکن میری دھنوں کے لیے میرا اپنا عود زیادہ مناسب رہے گا۔ اگر اجازت ہو تو لے آؤں؟'

میرا اصل نام ابوالحسن ابن نافع تھا، لیکن غالباً میری سیاہ رنگت اور آواز کی وجہ سے لوگ مجھے زریاب کہتے تھے، جو عربی میں ایک سیاہ خوش الحان پرندے کا نام ہے۔

خلیفہ ہارون الرشید کی طرف سے اجازت عطا ہوتے ہی میں باہر چلا گیا۔ میں نے خلیفہ کے دربار میں باریابی سے قبل اپنا عود محل کے صدر دروازے پر دربانوں کے پاس رکھوا دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب میں اپنا عود لے کر واپس آ گیا تو استادِ باراں دیدہ اور خلیفہ دونوں نے بھانپ لیا کہ میرے عود میں عام رواج کے خلاف چار کے بجائے پانچ تار تھے اور ان کو بجانے کے لیے مستعمل لکڑی کے عام مضراب کی بجائے میرے ہاتھ میں عقاب کا پنجہ تھا۔

میں نے عود کے تار چھیڑ دیے۔ یہ لمحہ زندگی کا ماحصل تھا۔ یہ وہ لمحہ تھا جس کی تیاری کے لیے میں نے سالہا سال خونِ جگر جلایا تھا۔ خلیفہ کے حضور اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کی خواہش کرۂ ارض کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلی ہوئی اس عظیم سلطنت میں بسنے والے ہر فن کار کے دل میں موج زن تھی، اب قسمت سے مجھے یہ موقع نصیب ہوا تھا، اور میں اس دورانیے کے ایک ایک ثانیے کو کشید کر کے اپنے حق میں استعمال کرنا چاہتا تھا۔

میری تمنا تھی کہ میں اپنا خونِ جگر نچوڑ کر خلیفہ کے دربار کی فضا میں لوبان کی خوشبو کی طرح بکھیر دوں۔

کچھ دیر تک تو میں آواز سے ساز ملاتا رہا، پھر میں نے گانا شروع کیا اور بتدریج تان اونچی کرتا چلا گیا۔ کوشش تھی کہ ساز و آواز میں اس قدر ہم آہنگی ہو کہ یوں لگے دونوں آوازیں یا تو گلے سے نکل رہی ہیں، یا پھر میرے پنج تارا عود سے۔

....

آج قرطبہ میں ہماری آخری رات تھی۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ جس نے فلیمنکو ناچ نہیں دیکھا، اس نے سپین نہیں دیکھا۔ چنانچہ میں بھی ہوٹل کی لابی میں پڑے بروشر کی مدد سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر قرطبہ کے مشہور فلیمنکو کلب ال تابلو فلیمنکو دی آرینال پہنچ گیا۔ کلب کا ہال شائقین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اتفاق سے وہیں میرے ہی گروپ کے معمر آسٹریلین جوڑے نیول اور ان کی بیگم سے ملاقات ہو گئی۔ بڑی مشکل سے مجھے اور انھیں ایک میز پر جگہ ملی۔

سامنے سٹیج پر مسجدِ قرطبہ کی طرز پر سرخ و سفید اینٹوں سے بنی محرابیں ماحول کو افسانوی رنگ

دے رہی تھیں۔ سٹیج نیم تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ چند سازندوں کے ہیولے نظر آرہے تھے جو گٹار کی دھن پر الاپ دے رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ایک گلوکار کی پرسوز آواز الاپ سے الگ ہو کر فضا میں بکھری، سرخ پردہ ہٹا، روشنیاں تیز ہوئیں اور ٹخنوں تک آتے ہوئے سرخ فراک میں ملبوس ایک رقاصہ آہستگی سے چلتے ہوئے سٹیج کے وسط تک آ گئی۔

چند سازندوں نے تالیوں کی تھاپ دینی شروع کر دی۔ گٹار کی دھن تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی۔ تاریکی میں بیٹھی ہوئی گلوکارہ کی آواز بلند ہوئی، جو پہلے پہل تو صرف ماتمی فریاد کی صورت میں تھی، لیکن محفل گرم ہونے کے بعد اس میں بول بھی نمایاں ہونا شروع ہو گئے۔ عام مغربی ناچ کے برعکس فلیمنکو میں ہاتھوں اور بازوؤں کا ڈرامائی استعمال اس کے مشرقی ماخذ کی غمازی کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ نغمے کی تانیں بھی قرآنی تلاوت اور اذان کا شائبہ گزرتا ہے۔

رقاصہ نے لکڑی کے فرش پر تیز تیز تھاپ دے کر ٹیپ ڈانسنگ کی طرح گٹار کی دھن کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔ گلوکارہ کی آواز سے درد جھلکنے لگا۔

....

خلیفہ محویت کے عالم میں اور استادِ محترم حیرت کی کیفیت میں سنتے رہے۔ جب میں گانا ختم کر کے کورنش بجالایا تو ان کے چونکنے سے مجھے احساس ہوا کہ وہ کتنی محویت کے عالم سے سن رہے تھے۔ تمام فنونِ لطیفہ میں سب سے تجریدی فن موسیقی ہے، کیوں کہ اس میں صرف آواز کے غیر مرئی رنگوں سے سامعین کے ذہن کے پردے پر جذبات، تاثرات اور کیفیات کا نقش بنایا جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود میرا مشاہدہ ہے کہ احساس کی سطح سے نیچے ایسے کچھ ایسے جذبات و تاثرات بھی پائے جاتے ہیں جن کا کسی اور طریقے سے اظہار نہیں ہو سکتا اور جنھیں صرف موسیقی ہی زبان عطا کر سکتی ہے۔

خلیفہ نے اپنے گلے میں پڑا موتیوں کا ہار عنایت کیا، اور اگلے جمعے دوبارہ حاضری کا حکم دیا۔ وزیر جعفر برمکی نے جیب میں ہاتھ ڈال کر جتنی اشرفیاں ہاتھ میں آئیں، میری جھولی میں ڈال دیں۔ ابونواس نے میری تعریف میں چند فی البدیہہ اشعار پڑھے۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور اجازت لے کر دربار سے باہر آ گیا۔ استاد اسحٰق موصلی بھی لپک کر میرے پیچھے ہو لیے۔ مجھے ان کے تیور بہت جارحانہ لگے:

'زریاب، تمھاری یہ جرات کہ تم مجھے بھرے دربار میں یوں دھوکا دو؟'

'دھوکا؟ استادِ محترم، میں آپ کو دھوکا دینے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔'

'تم نے یہ دھنیں اور یہ ساز مجھ سے چھپا کر کیوں رکھے تھے؟' استاد کی آواز بلند ہوتی گئی۔

'استادِ مکرم، چراغ سے چراغ جلتا ہے، میں نے جو کچھ سیکھا ہے وہ آپ ہی سے سیکھا ہے، اس اکتساب میں اگر میں نے کچھ اختراع کی ہے تو اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے؟'

'دیکھو زریاب، میری بات غور سے سنو،' استاد نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا، 'ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں، اب یا تو تم بغداد میں رہو گے یا میں۔ دربار کے موسیقارِ اعلیٰ کا یہ مقام میں نے زندگی بھر کی ریاضت سے حاصل کیا ہے، اور میں اسے کسی قیمت پر ہاتھ سے نہیں جانے دوں گا، چاہے اس کے لیے مجھے کوئی بھی ناخوش گوار قدم اٹھانا پڑے۔'

'استادِ محترم، آخر میرا قصور کیا ہے؟'

'تمھارا قصور یہ ہے کہ تم میدانِ موسیقی میں اسحٰق موصلی سے آگے بڑھنے کے لیے پر تول رہے ہو، اور میں یہ مقام اپنے سگے بیٹے کے لیے بھی چھوڑنے کا روادار نہیں۔'

'لیکن استاد۔۔۔'

استاد نے میری بات کاٹ کر لفظ چباتے ہوئے کہا، 'سنو، میں تمھارے سامنے دو راستے رکھ رہا ہوں۔ اگر تم یہیں رہو تو میں تمھیں ہر صورت میں راستے سے ہٹا دوں گا چاہے کچھ بھی ہو۔ دوسرا راستا یہ ہے کہ تم کل سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے بغداد چھوڑ دو۔ میں تمھیں اتنی رقم دے دوں گا کہ تمھیں کئی برس تک روزی کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ بولو، تمھیں کیا منظور ہے؟'

میں رات بھر کروٹیں بدل بدل کر استاد کی تجاویز کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا رہا۔ لیکن میرے پاس کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ میں بغداد میں رہ کر خلیفہ کے چہیتے اور منھ چڑھے درباری سے چپقلش مول نہیں لے سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے استاد سے اشرفیوں کی تھیلی وصول کی اور پو پھٹنے سے قبل مغرب کی سمت جانے والے پہلے قافلے کے ہم رکاب ہو گیا۔

....

فلیمنکو میں اس قدر سوز و گداز کہاں سے آیا؟ اس کے لیے ہمیں تاریخ کے ورق پلٹنا پڑیں

گے۔ فلیمنکو روایتی طور پر سپین کے پچھڑے ہوئے، دھتکارے ہوئے طبقوں کا فن ہے۔ زیرِ زمین عربوں، یہودیوں اور جپسیوں کا مشترکہ ورثہ۔

جپسیوں کو صدیوں سے استحصال کا نشانہ بنایا جاتا رہا ہے۔ مسلمانوں اور یہودیوں کی طرح ایک زمانے میں حکمرانوں نے جپسیوں پر بھی اپنی زبان بولنے اور اپنا مخصوص لباس پہننے پر پابندی لگا دی تھی۔ آج بھی سپین میں جپسی معاشرے کے نچلے طبقے میں شمار ہوتے ہیں۔ بیتی صدیوں کو تو جانے دیجیے، 1960ء کی دہائی میں اشبیلیہ کے جپسیوں کو شہر بدر کر دریائے وادی الکبیر کے مغربی کنارے پر نوتعمیر کردہ بستی لاس ترِیس مل (تین ہزار گھر) میں منتقل کر دیا گیا۔ آج بھی اشبیلیہ میں سیاحوں کو خاص طور پر تلقین کی جاتی ہے کہ وہ ترِیس مل کی طرف نہ جائیں ورنہ جیب کٹ جانے یا کیمرا چھن جانے کا خدشہ ہے۔

صرف سپین نہیں، یورپ بھر میں جپسیوں کی یہی شہرت ہے کہ وہ چور اچکے اور اٹھائی گیرے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سپین کی جیلوں میں جپسیوں کی بڑی تعداد بند ہے۔ جپسی اسی صدیوں پرانے استحصال کو فلیمنکو کے بولوں میں ڈھالتے ہیں۔ جیلوں میں اسیر جپسی خاص طور پر 'بین الزنداں' فلیمنکو مقابلوں کا اہتمام کرتے ہیں۔ اندر کی بات جاننے والے کہتے ہیں کہ کلبوں میں پیش کیا جانے والا فلیمنکو تو کاغذ کے نمائشی پھولوں کی مانند ہے، اصل فلیمنکو کا مزا لینا ہو تو جیلوں کے اندر ہونے والے مقابلوں کا نظارہ کیجیے۔ اس دعوے کی کچھ کچھ تائید بعض فلیمنکو بولوں سے بھی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر:

خاموشی کی گھنٹیاں بج چکیں
اب سب کو خاموش رہنے کا حکم ہے
اب جب دوبارہ گھنٹیاں بجیں گی
ماں!
یہ صبح اٹھ جانے کا اشارہ ہوگا
جب میں جیل میں تھا
میرا صرف ایک مشغلہ تھا
وقت کاٹنا

اپنے پاؤں میں پڑی زنجیر کے
حلقے گن گن کر *

مصیبت کے وقت کسی بالغ مرد کا ماں کو پکارنا یورپی کم اور ایشیائی تصور زیادہ معلوم ہوتا ہے (مائے نی میں کنوں آکھاں۔۔۔)، لیکن جپسی خود بھی یورپی کم اور ایشیائی زیادہ ہیں۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ دراصل وہ خانہ بدوش ہیں جو آج سے ایک ہزار سال قبل ہندوستان سے ہجرت کر کے سپین اور یورپ کے دوسرے ملکوں میں جا بسے تھے۔

....

بغداد سے نکل کر میں مصر پہنچا اور پھر دشت و قریہ کی خاک چھانتا، چھوٹے بڑے امیروں اور سرداروں کے ہاں قسمت آزمائی کرتے کرتے بالآخر تیونس کے دربار سے وابستہ ہو گیا۔ لیکن کچھ عرصے بعد دل وہاں سے بھی اچاٹ ہو گیا۔ کہاں بغداد کی زرق برق زندگی کی رنگا رنگیاں اور کہاں یہ مضافاتی صحرائی رجواڑے۔

یہیں میں نے بحیرۂ روم کے پار اندلس میں آباد شاداب اموی سلطنت کے چرچے سنے۔ کچھ دوستوں کے ذریعے سن گن لینے کی کوشش کی تو حوصلہ افزا ردِعمل ملا۔ میں اندلسی حکمران الحکم کی خدمت میں معروض گزار ہوا کہ میں ان کے دربار سے وابستہ ہونا چاہتا ہوں۔ الحکم پہلے اندلس کے پہلے اموی امیر عبدالرحمٰن الداخل کے پوتے تھے۔

امیر الحکم نے مجھے لکھا کہ میں جتنی جلد ممکن ہو سکے، قرطبہ پہنچ جاؤں، وہ مجھے اپنا درباری موسیقار مقرر کر دیں گے۔ میں نے فوراً زادِ راہ اکٹھا کیا اور افتاں و خیزاں اندلس جا پہنچا۔ لیکن وائے قسمت، ایک مہینے کے جاں گسل سفر کے بعد میں ابھی قرطبہ سے چند میل دور پہنچا تھا کہ خبر ملی امیر الحکم دنیا سے پردہ فرما گئے ہیں۔ میں نے وہیں پڑاؤ ڈال دیا اور واپسی کی تیاری کرنے لگا۔ جب وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ بنانا تھا تو پھر آگے بڑھنے سے کیا حاصل؟

لیکن خدا بھلا کرے، نئے امیر عبدالرحمٰن ثانی کے یہودی درباری موسیقار ابوالنصر منصور کا، جس نے نئے امیر کے سامنے میری اتنی تعریفیں کیں کہ انھوں نے کمال مہربانی سے اپنا نمائندہ بھیج

---

* اس گیت کے بول اشبیلیہ کے بدنصیب شہنشاہ معتمد کی اس نظم کی یاد دلاتے ہیں، جس کا علامہ اقبال نے ترجمہ کیا ہے۔ معتمد کا تفصیلی ذکر اگلے باب میں آئے گا۔

کر مجھ سے قرطبہ آنے کے لیے کہا۔

جب میں 822ء میں قرطبہ کے صدر دروازے سے اندر داخل ہوا تو میری شہرت کے افسانے مجھ سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکے تھے۔ اور کیوں نہ ہو، بغداد اس زمانے میں دنیا کا علمی اور ثقافتی گڑھ اور میں اسی بغداد کا نمائندہ تھا۔ امیرِ اندلس کے امرا نے فصیلِ شہر سے باہر آ کر میرا استقبال کیا۔

قرطبہ میں مجھے جو عزت اور مرتبہ ملا، میں اس کا میں بغداد میں صرف خواب ہی دیکھ سکتا تھا۔ امیر نے مجھے سنے بغیر ہی موسیقارِ اعلیٰ کے رتبے پر فائز کر دیا۔ اور جب انھوں نے مجھے سنا، تو پھر وہ کسی اور گلوکار کو نہیں سنتے تھے۔

....

جدید جینیاتی مطالعوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جپسیوں* کا ایک گروہ جس کی تعداد ایک ہزار کے لگ بھگ تھی، کوئی ایک ہزار سال پہلے ہندوستان سے نکل کر یورپ میں آ بسا تھا۔ لیکن ڈی این اے پر مبنی اس سائنسی تحقیق سے بہت پہلے بھی یہ خیال ظاہر کیا جاتا رہا ہے کہ جپسی دراصل پنجاب سے آئے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جپسی زبان شمالی ہندوستان کی زبانوں پنجابی، اردو، راجستھانی، وغیرہ سے بہت ملتی جلتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ماہرینِ لسانیات نے زبان میں پائے جانے والے خارجی الفاظ کا جائزہ لینے کے بعد یہ نتائج بھی اخذ کیے ہیں کہ جپسی کہاں کہاں سے ہو کر یورپ پہنچے تھے۔ مثال کے طور پر اس زبان میں ترکی کے الفاظ کی موجودگی سے پتا چلتا ہے کہ جپسی ترکی سے ہو کر گزرے تھے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ انگریزی میں بھی چند جپسی الفاظ پائے جاتے ہیں، مثال کے طور پر pal اور lollipop۔ چند رومانی الفاظ اور ان کا اردو کے ساتھ تقابل دیکھیے۔

اردو	رومانی
پانی	پانی

*یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو جپسی کہلوانے کی بجائے رومانی (Romani) کہلوانا زیادہ پسند کرتے ہیں، کیوں کہ لفظ جپسی کے ساتھ منفی انسلاکات وابستہ ہیں، بالکل انھی وجوہات کی بنا پر امریکہ میں کالوں کو نیگرو کی بجائے ایفریکن امریکن کہنے کو ترجیح دی جاتی ہے تاکہ نسلی تعصب کا شائبہ نہ آنے پائے۔

بڑا	برو
بال	بال
بخت	بخت
بخشیش	بخشیش
چور	چورو
دانت	دانت
دیکھ	دیک
پیو	پی
موت	مورتے
گرم	گھم،تو
ہاتھ	ہاتھ
سر	سرو
کون	کون
لال	لالو
ناک	ناک
نام	ناو
بہن	بَہن
پیر	پیر
تمہارے	تمارے
کون ہو؟	کون سون؟
کیا کرتے ہو؟	سوکریس؟
کدھر سے آئے ہو؟	کتر آویس؟
ادھر آؤ	آوے کری
کتنے برس کے ہو؟	سودی برش ستو؟

....

قرطبہ میں قدم جمانے کے بعد میں نے پہلا کام یہ کیا کہ یہاں موسیقی کی تربیت کا ادارہ قائم کر دیا، جس میں نہ صرف مردوں بلکہ خواتین کو بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ تاہم اندلسی دربار میں میرا کردار صرف موسیقی تک ہی محدود نہیں تھا۔ جلد ہی میں ثقافت کے وزیر کے طور پر کام کرنے لگا۔ میں نے قرطبہ میں دیکھا کہ یہاں دولت کی تو فراوانی ہے لیکن نشست و برخاست، رہن سہن اور بود و باش میں وہ نفاست اور رکھ رکھاؤ نہیں ہے جو میں بغداد کے شاہی دربار اور امراء اور رؤسا کے ہاں دیکھتا چلا آیا تھا۔ چنانچہ میں نے قرطبہ کی اموی سلطنت کو جدید ثقافتی خطوط پر آراستہ کرنے کا بیڑا اٹھا لیا۔

قرطبہ کی مٹی بے حد زرخیز تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے فیشن کے ضمن میں میری ہر بات کو پتھر پر لکیر سمجھا جانے لگا۔

سب سے پہلے تو میں نے خورد و نوش پر توجہ دی۔ میں نے دیکھا کہ ہر طرح کا کھانا بغیر کسی ترتیب یا قرینے کے تناول کر لیا جاتا ہے۔ میں نے تجویز پیش کی کہ کھانے میں سب سے پہلے یخنی پیش کی جائے گی، اس کے بعد اصل کھانے کی باری آئے گی، اس کے بعد شیرینی اور آخر میں خشک میوے یا پھل۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ ترتیب نہ صرف اندلس کے طول و عرض میں رائج ہو گئی بلکہ کچھ برسوں کے بعد معلوم ہوا کہ ارضِ کبیر یعنی یورپ میں بھی کھانے کے ان آداب نے قبولِ عام کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔

میں نے دیکھا کہ لوگ مجھ سے اس قدر عقیدت اور محبت رکھتے تھے کہ جو لباس میں پہنتا، وہ راتوں رات قرطبہ بھر میں مقبول ہو جاتا۔ میں نے اس خوش گوار صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر موسم کے لحاظ سے لباس اور اس کا رنگ منتخب کرنے کے چلن کو فروغ دیا۔ گرمیوں میں سفید یا ہلکے رنگوں کے کپڑے اور سردیوں میں شوخ رنگوں کے بھاری روئی دار لبادے۔ اس کے علاوہ میں نے موقعے کی مناسبت سے کپڑے تبدیل کرنے کی طرح بھی ڈالی ورنہ اس زمانے میں اندلسی تاریخ دان البکری کے بقول

> 'شمال میں بسنے والے عیسائیوں کا یہ عالم ہے کہ وہ ایک بار پہننے کے بعد کپڑے کبھی نہیں اتارتے، حتیٰ کہ وہ چیتھڑا چیتھڑا ہو کر ان کے جسموں سے

گر جاتے ہیں۔'

....

کتابوں کے فلیپوں اور نمائشی تقریبات میں عہد ساز کی اصطلاح بہت بے دردی سے ہر کس و ناکس کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔لیکن تاریخ میں کم ہی شخصیات ایسی ہوں گی جو اس خطاب کی زریاب سے زیادہ حق دار ہوں۔اس نابغۂ روزگار کا انتقال 857ء میں ہوا۔لیکن مرتے مرتے وہ قرطبہ کو نہ صرف اندلس کا بلکہ تمام یورپ کا ثقافتی اور تمدنی مرکز بنا گیا۔اس نے اپنی نفاست، اعلیٰ ذوق اور شائستگی سے جس تہذیب کی بنیاد رکھی، وہ عبدالرحمٰن ثالث کے عہد تک رشکِ بغداد و دمشق بن گئی۔

جلد ہی دورِ ظلمات میں گھرے ہوئے یورپ بھر سے علم وفن کے پروانے قرطبہ کا رخ کرنے لگے، اور اس خیرہ کن تہذیب کی شمع کی روشنی سے فرانس، برطانیہ اور جرمنی کے تاریک گوشے منور ہونے لگے۔وہ شمع، جسے روشن کرنے دوسروں کے ساتھ زریاب کا بھی اہم کردار تھا۔

'فور کورس ڈنر' کے علاوہ زریاب نے کئی اقسام کے کھانے بھی متعارف کروائے، جن میں اخروٹ اور شہد سے بنائی جانے والی ایک مٹھائی شامل ہے جو آج بھی سپین کے شہر سارا گوسا میں ملتی ہے۔ نائیجیریا میں نارنجی رنگ کی ایک مٹھائی بہت شوق سے کھائی جاتی ہے جس کا نام 'زلابیا' ہے۔بہت سے مقامی لوگوں کا خیال ہے کہ یہ زریاب ہی کی ایجاد ہے اور اس کے نام کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔*

میں نے بالوں کی نئی تراش بھی متعارف کروائی جو راتوں رات مقبولِ عام وخواص ہوگئی۔ مجھے الکیمیا میں تھوڑا بہت درک تھا، اسی سے فائدہ اٹھا کر میں نے اہلِ اندلس کو سب سے پہلا بوُرش اور دانتوں کے منجن کا استعمال متعارف کروایا۔یہ منجن نہ صرف دانتوں کی خوب صفائی کرتا تھا بلکہ خوش ذائقہ بھی تھا۔

میں نے شاہی محل کے قریب خواتین کے لیے مشاطگی کا مرکز بھی کھولا جس میں بالوں کی نئی نئی تراشیں، ابروؤں کو سنوارنے، غیر ضروری بالوں کو بال صفا سے ختم کرنے کے ساتھ ساتھ جدید ترین خوشبویات اور عطریات اور نت نئی حسن افزا مصنوعات کے استعمال کی تربیت دی جاتی تھی۔

---

* چونکہ لفظ زلابیا اور جلیبی بہت ملتے جلتے ہیں، اس لیے عین ممکن ہے کہ جلیبی کی ایجاد میں بھی زریاب کا کچھ نہ کچھ ہاتھ رہا ہو کیونکہ ہندوستان میں جلیبی کا سراغ پندرھویں صدی سے پہلے نہیں ملتا۔

امیرِ اندلس عبدالرحمٰن ثانی مجھے بے حد عزیز رکھتے تھے اور وہ مجھ سے انتظامی اور سیاسی امور میں بھی مشورہ کیا کرتے تھے۔ میرے ہی مشورے پر انھوں نے دوسرے ملکوں سے علما و فضلا، شعرا وادبا اور دانش وروں کو قرطبہ بلایا۔ حتیٰ کہ اس دور میں ہندوستان تک سے ماہرینِ نجوم اندلس گئے۔ جس سے بہت جلد قرطبہ یورپ کا سب سے متمدن شہر بن گیا۔

....

جدید ماہرینِ لسانیات کا خیال ہے کہ لفظ فلیمنکو عربی الفاظ 'فلاح منغو' کی بگڑی ہوئی شکل ہے، جس کا مطلب 'مفرور کسان' تھا۔ جب سولہویں صدی میں مسلمانوں پر جبر کا دور شروع ہو گیا تو بہت سے مسلمان شہروں کو چھوڑ کر چھوٹے چھوٹے دیہات کو ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ وہیں ان کا میل جول جپسیوں سے ہوا جو خود معاشرے کے دھتکارے ہوئے تھے۔ انھی دو پچھڑی ہوئی قوموں کے ثقافتی امتزاج سے فلیمنکو وجود میں آیا۔ ساتھ ہی ساتھ اس میں کچھ اجزا یہودیوں کی طرف سے بھی آئے جو سپین کی تیسری مظلوم قوم تھے۔

عربوں سے پہلے یورپ میں صرف دو سٹرنگ ساز بجائے جاتے تھے، rote اور harp۔ مسلمانوں نے یورپ میں جو ساز متعارف کروائے وہ تمبورین (دف)، لُوٹ، اور گٹار ہیں۔

آج گٹار کے بغیر مغربی موسیقی بالعموم اور ہسپانوی موسیقی بالخصوص ادھوری لگتی ہے۔ لیکن گٹار جیسا 'مغربی' ساز دراصل مسلمانوں کے ساز عود کی بدلی ہوئی شکل ہے۔

اس زمانے میں شاعری اور موسیقی شانہ بشانہ چلتے تھے، اس لیے موسیقی پر بات کرتے ہوئے شاعری کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ عظیم جرمن فلاسفر نطشے لکھتا ہے، 'جذباتی محبت ہم یورپیوں کا خاصہ ہے۔۔۔ اسے پراونس (جنوبی فرانس) کے شاعر سورماؤں (poetsknight) نے ایجاد کیا تھا۔ یورپ بہت کچھ، بلکہ تقریباً سب کچھ، کے لیے انھی کا مرہونِ منت ہے۔'

جوزف کیمپبل، مشہور ماہرِ اساطیر، تو اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر دعویٰ کرتا ہے کہ یہ رومانی محبت (courtly love) ہے جس قرونِ وسطیٰ کی گھٹن زدہ عیسائی دنیا کو آزاد کرایا، کیوں کہ اسی کی وجہ سے کلیسا پر تنقید کا عمل شروع ہوا، جو نہ صرف ریفارمیشن، بلکہ سائنسی انقلاب پر منتج ہوا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس درباری محبت کا منبع کیا ہے؟ علما اس بات پر متفق ہیں کہ اس صنف کا آغاز جنوب مشرقی فرانس کے اس علاقے سے ہوا جس کو پراونس کہا جاتا ہے۔ اسی

علاقے میں ولیم آف اکویٹین نے گیارھویں صدی میں وہ شاعری تخلیق کی جن کی وجہ سے انھیں یورپی شاعری کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ اس زمانے کے رواج کے برخلاف ولیم نے لاطینی زبان میں نہیں، بلکہ مقامی زبان، یعنی فرانسیسی میں شاعری کی۔ جہاں لاطینی شاعری میں عام طور پر عشقِ حقیقی پر زور دیا جاتا تھا، ولیم کی شاعری ایک ناقابلِ حصول محبوبہ سے والہانہ عشق سے عبارت ہے۔ ولیم کی شاعری کی بے پناہ مقبولیت کے بعد فرانس اور یورپ کے دوسرے حصوں میں گلوکار شاعروں کی ایک کھیپ ابھر آئی جنھیں ٹروباڈور (troubadors)* کہا جاتا ہے۔ یہ شاعر بربط کی سنگت میں شہر شہر اپنا کلام گاتے ہوئے جاتے تھے۔ اس شاعری کی چند نمایاں خصوصیات یہ ہیں: محبوبہ ہمیشہ بے حد خوبصورت، سنہرے بالوں والی، اونچے خاندان والی ہوتی ہے، جب کہ عاشق ہمیشہ بے چارہ، غم کا مارا، سردی، گرمی سے بے نیاز، محبوبہ کی ایک نظرِ کرم کی آس میں اس کے در پر پڑا رہتا ہے۔ یہی پراونسال شاعری تمام یورپی ادب کی ماں ہے۔

جنوبی فرانس میں یہ شاعری کہاں سے آئی؟ اندلس سے۔ روایتی عربی شاعری ایک زمانے سے جمود کا شکار ہو چلی تھی۔ وہی گھسے پٹے مضامین، از کار رفتہ تشبیہات و استعارے، اور یبوست زدہ ہیت۔ لیکن اندلس کے متحرک معاشرے نے جہاں علم و فن کے دوسرے میدانوں میں اختراعات کیں، وہیں انھوں نے عربی شاعری کو بھی نیا موڑ دیا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا نام مقدم القبر ی ہے۔ قرطبہ کے باسی اور دسویں صدی عیسوی کے اس شاعر نے ایک نئی صنف متعارف کروائی جسے موشح کہا جاتا ہے۔ مواشح ایک قسم کا گیت ہیں جن میں مختصر سطریں، ردیف اور قافیہ ہوتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ حیرت انگیز طور پر آخری بند مقامی زبان میں ہوا کرتا تھا، جسے 'خارجہ' کہا جاتا ہے۔**

---

*اس بات پر بڑی بحث ہوئی ہے کہ یہ لفظ ٹروباڈور کہاں سے آیا ہے۔ دورِ جدید کے بہت سے ماہرین کا خیال ہے کہ اس کا ماخذ عربی لفظ 'طرب' ہے جس کا مطلب ہے گیت۔

**اردو کے ابتدائی زمانے میں ہندوستان میں بھی اس قسم کی مخلوط شاعری کی گئی ہے، جس میں فارسی اشعار کے بیچ اردو کا پیوند لگایا جاتا تھا، اور اس قسم کی شاعری کو ریختہ کہا جاتا تھا۔ امیر خسرو سے منسوب غزل 'زحالِ مسکیں مکن تغافل' اس کی مشہور مثال ہے۔

مواشح کے موضوعات؟ عشقِ مجازی، ایک نا قابلِ حصول محبوبہ کی تمنا، اور خمریات۔ اس قسم کی شاعری مدینہ الزہرا کے باسی ابنِ حزم کے ہاتھوں اپنے نصف النہار تک پہنچی۔ ان کی کتاب 'طوقِ حمامہ' (فاختہ کا ہار) اس موضوع پر حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے۔

اسی ابنِ حزم کا ایک روحانی شاگرد آندریئس کا پیلانس (Cappelanus Andreas) تھا، جس کی کتاب 'محبت کا فن' ابنِ حزم کی طوق حمامہ سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی۔ ابنِ حزم کے زمانے ہی میں اندلس میں خانہ بدوش شاعروں کی ایک فصل تیار ہو گئی تھی جو قریہ قریہ گھوم کر اپنا کلام سناتے تھے اور بادشاہوں اور نوابوں سے داد و انعام پاتے تھے۔ یہ شاعر گویے اکثر عیسائی ریاستوں میں بھی جا کر اپنے فن کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔

1063ء میں ایک متحدہ یورپی لشکر نے شمالی اندلس کے شہر بارباسترو پر ہلہ بول کر شہر کو تباہ کر دیا اور آبادی کو تہِ تیغ کر دیا۔ تمام عورتوں کو لونڈیاں بنا کر فرانس لے جایا گیا۔ ان میں سے بہت سی عورتیں پیشہ ور گلوکارائیں تھیں جنھیں 'قیان' کہا جاتا تھا اور یہ مواشح گا کر پیٹ پالتی تھیں۔ بارباسترو لشکر کی قیادت اسی ولیم ایکوٹین کے باپ نے کی تھی۔ اس نے اپنے باپ کے محل میں مواشح گانے والی ان مغنیاؤں کا کلام سنا ہو گا جس سے اسے رومانی محبت پر مبنی یورپی شاعری کی تحریک ہوئی۔

مغرب نے مسلم تہذیب سے صرف ساز اور اصنافِ سخن ہی نہیں اخذ کیں، مغربی موسیقی کی تھیوری پر بھی مسلمانوں نے گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی مثال مغربی میوزیکل نوٹیشن ہے جس کے ارکان براہِ راست عربی حروفِ تہجی سے لیے گئے ہیں۔

Arabic Alphabet	Mim	Fa	Sad	Lam	Sin	Dal	Ra
Notes Musical	mi	fa	sol	la	si	do	Re

مسلمان موسیقاروں نے نویں صدی عیسوی میں میوزیکل نوٹیشن کا استعمال شروع کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں زریاب کے استاد اسحٰق موصلی پیش پیش تھے۔ یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ زریاب یہ نظام لے کر اندلس آیا ہو گا اور اس نے قرطبہ میں موسیقی کا جو سکول قائم کیا تھا، وہاں اسے پڑھایا جاتا ہو گا۔

ساقیِ اربابِ ذوق

PDF BOOK COMPANY

مدد، مشاورت، تجاویز اور شکایات :

Muhammad Husnain Siyalvi
0305-6406067
Sidrah Tahir
0334-0120123
Muhammad Saqib Riyaz
0344-7227224

ہمتِ پرواز

مسجدِ قرطبہ سے کسی قدر نشیب میں بہتے ہوئے دریائے کبیر کے کنارے کنارے چلتے ہوئے ایک جدید طرز کا پل نظر آتا ہے۔ یہ پل دور سے دیکھنے میں پرندے کے پروں کی طرح نظر آتا ہے۔ معلوم نہیں اسے کس میٹریل سے تعمیر کیا گیا ہے لیکن بظاہر یہ بہت ہلکا پھلکا اور لچکیلا معلوم ہوتا ہے۔

یہ ابنِ فرناس پل ہے۔ لیکن ابنِ فرناس کون تھا اور سپین کی حکومت نے کسی گم نام عرب کے نام پر ایک بے حد جدید پل کا نام کیوں رکھا، اور پل کی شکل پر کی مانند کیوں ہے؟

اس سوال کا جواب دینے کے لیے ہمیں ایک درجن صدیاں پیچھے جانا پڑے گا۔ آج بچہ بچہ جانتا ہے کہ اطالوی مصور لیونارڈو داونچی وہ پہلا شخص ہے جس نے گلائیڈر کے ڈیزائن بنائے تھے۔ لیکن تاریخ کے اوراق سے گرد جھاڑنے سے پتا چلتا ہے کہ قرطبہ کے ایک باسی ابنِ فرناس نے داونچی سے کوئی پانچ سو برس قبل ہی گلائیڈر کا تجربہ کر دکھایا تھا۔

عباس ابنِ فرناس 810ء میں پیدا ہوا تھا۔ اس زمانے کے عام چلن کے مطابق وہ کئی علوم کا ماہر تھا، طبیعیات، طب، فلکیات، ریاضی۔ عین ممکن ہے کہ 822ء میں زریاب کے قرطبہ میں براجمان ہونے کے بعد ابنِ فرناس نے اس کا شہرہ سنا ہو، کیوں کہ تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ وہ موسیقی پڑھنے کے لیے قرطبہ آیا تھا۔ قرینِ قیاس ہے کہ نوجوان ابنِ فرناس نے زریاب کے میوزک سکول میں موسیقی کا درس لیا ہو۔ لیکن ابنِ فرناس کی اصل دل چسپی سائنس میں تھی۔ وہ پرندوں کے پروں کا بغور مشاہدہ کیا کرتا تھا اور اس کا یہ قول مشہور ہے کہ انسانی ذہن نے آج تک ایسی کوئی چیز ایجاد نہیں کی جو پیچیدگی میں کسی پرندے کے پر کا مقابلہ کر سکے۔

اس کمی کو دور کرنے کے لیے 875ء کے قریب ابنِ فرناس نے ایک ایسا گلائیڈر تیار کیا

جس میں لکڑی کے ڈھانچے کے اندر پرندوں کے پر نصب کیے گئے تھے۔ وہ یہ گلائیڈر لے کر ایک قریبی پہاڑی پر واقع برج کے اوپر چڑھ گیا۔ عینی شاہدین نے آگے کا احوال کچھ یوں بیان کیا ہے:

ابنِ فرناس نے قرطبہ کے باسیوں کو اپنی پرواز کا نظارہ کرنے کے لیے دعوت دی اور جب اچھا خاصا ہجوم اکٹھا ہوگیا تو اس نے انھیں مخاطب ہو کر کہا:

> 'اب میں آپ لوگوں سے رخصت چاہتا ہوں۔ میں ان پروں کو پرندوں کی طرح اوپر نیچے حرکت دے کر اوپر اٹھوں گا۔ اگر سب کچھ منصوبے کے مطابق عمل میں آیا تو میں کچھ دیر تک پرواز کرنے کے بعد آپ کے درمیان لوٹ آؤں گا۔'

ہجوم میں کئی لوگوں کا خیال تھا کہ ابنِ فرناس کا دماغ چل گیا ہے۔ کچھ لوگ اس کی سلامتی کے بارے میں بھی تشویش کا شکار تھے۔

تاریخ دان ابن مقری لکھتا ہے کہ ابنِ فرناس برج سے زقند لگانے کے بعد خاصے فاصلے تک پرندوں کی طرح پرواز کرتا رہا۔ لیکن جب اس نے واپس اسی جگہ اترنے کی کوشش کی جہاں سے پرواز شروع کی تھی تو توازن برقرار نہ رکھ سکا اور نیچے گر گیا۔ بعد میں اس نے کہا کہ اس کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ اس نے دم کا خیال نہیں رکھا تھا، اور پرندے دم کی مدد سے مڑتے ہیں۔

اس حادثے میں ابنِ فرناس کی کمر زخمی ہوگئی جس کے باعث وہ دوبارہ اڑنے کے قابل نہیں رہا۔ تاہم اس کے تجربے کی داستان کو یورپ کے دوسرے علاقوں تک پھیلنے میں دیر نہیں لگی۔ ایک سو برس بعد انگلستان میں ایک شخص نے جسم سے پر باندھ کر اڑنے کی کوشش کی اور ایک فرلانگ تک پرواز کرنے کے بعد گر کر ٹانگ تڑوا بیٹھا۔ حتیٰ کہ فرانسس بیکن تک نے اس نمونے کا گلائیڈر بنایا تھا۔ تاہم جیسا کہ ہم جانتے ہیں، سب سے زیادہ شہرت داونچی کے گلائیڈر کو حاصل ہوئی۔

اندلس کا تاج محل

ابنِ فرناس کے پل سے پہلے ہی ایک سڑک دائیں ہاتھ کو گھوم جاتی ہے۔ بورڈ پر لکھا ہوا ہے، 'مدینہ الزہرا۔' چند کلومیٹر کے بعد ایک پہاڑی کے دامن میں چند کھنڈرات نظر آتے ہیں، جنھیں دیکھ کر موہن جودڑو کے ٹیلے کی یاد آتی ہے۔ چند ٹوٹی ہوئی محرابیں، جن پر مسجدِ قرطبہ کی طرز کی سفید و سرخ اینٹیں سجائی ہوئی ہیں، بے کراں آسمان کے تلے کچھ بلند و پست شکستہ دیواریں، اکا دکا کھجور کے درخت اور سیاحوں کی ٹولیاں۔ دور کچھ کھیت، اور ایک طرف افق پر موجیں مارتا ہوا قرطبہ شہر۔

ان کھنڈرات کو دیکھ کر یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ یہ وہ شہر ہے ایک زمانے میں جس کی آب و تاب دیکھ کر یورپ کے سفیروں اور مندوبین کی آنکھیں چکا چوند اور دماغ ماؤف ہو جاتے تھے۔

مدینہ الزہرا عبدالرحمٰن ثالث نے 25 سالوں میں تعمیر کروایا تھا، لیکن یہ شہرِ خواب و خیال صرف 65 برس ہی قائم رہ سکا۔ پھر 1010ء میں شمالی افریقہ سے آنے والے بربروں نے اسے تاخت و تاراج کر دیا۔ یہ بربر کٹر مذہبی تھے اور انھیں مدینہ الزہرا کی زبردست شان و شوکت اسراف اور لہو و لعب میں لتھڑی ہوئی، اور اسلامی روایات کے منافی نظر آتی تھی۔ رفتہ رفتہ یہاں مٹی قدم جماتی گئی اور دو صدیوں بعد اس کا نام و نشان بھی زمین تلے دب گیا۔

مدینہ الزہرا کی تباہی کی داستانیں اندلسی شعرا نے درج کی ہیں۔ ابنِ حزم لکھتا ہے:

> جب میں نے قرطبہ سے آنے والے ایک مسافر سے استفسار کیا تو اس نے بتایا کہ اس نے شہر کے مغربی کنارے پر واقع بلاتِ مغیث میں ہمارا محل دیکھا ہے۔ اس کے آثار تک نابود ہو چکے ہیں۔ اس کی روشیں اکھاڑ دی گئی ہیں، اور وسیع گلستان نیست و نابود کر دیے گئے ہیں۔ رہی سہی کسر

گلنے سڑنے کے قدرتی عمل نے پوری کر دی ہے۔ جہاں نشاط انگیز پائیں
باغ تھے، اب وہاں صحرا بَین کرتے ہیں۔

مدینۃ الزہرا کی شان و شوکت کے قصے دیومالائی کہانیاں لگتے ہیں۔ ایک عرصے تک اسے محض عرب مورخوں کے زرخیز تخیل کی پیداوار سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ لیکن پھر نو صدیوں تک خاک تلے دبے رہنے کے بعد 1910ء میں شہر کی کھدائی شروع ہوئی تب معلوم ہوا کہ مؤرخوں نے بات فقط زیبِ داستان کے لیے نہیں بڑھائی تھی۔

جہاں زاد، کیسے ہزاروں برس بعد
اِک شہرِ مدفون کی ہر گلی میں
مرے جام و مینا و گلداں کے ریزے ملے ہیں
کہ جیسے وہ اِس شہرِ برباد کا حافظہ ہوں!

(حسن کوزہ گر، ن م راشد)

اب تک اس شہرِ مدفون کے صرف دس فی صد حصے کی بازیافت ہوسکی ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ مکمل کھدائی دو چار برس کی بات نہیں بلکہ اس میں ایک صدی لگے گی۔ ماہرینِ آثارِ قدیمہ کے سامنے یہ مخمصہ تھا کہ کھدائی کے دوران برآمد ہونے والی اشیا کو کیسے محفوظ رکھا جائے، کیوں کہ کسی عجائب گھر میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ وہ شہر بھر سے نکلے ہوئے آثار کو سمو سکتا۔ آخر فیصلہ کیا گیا کہ مدینۃ الزہرا کو ازسرِنو تعمیر کیا جائے گا اور جو چیز جہاں سے نکلی ہے، اسے تحقیق کے بعد اسی صورت میں نصب کر دیا جائے گا جس صورت میں وہ شہر کے ابتدائی نقشے میں موجود تھی۔

ظاہر ہے کہ یہ انتہائی محنت طلب کام ہے اور اس میں بسا اوقات ماہرین کو اندازوں اور تخمینوں پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ تاہم اب تک کی پیش رفت انتہائی متاثر کن ہے اور امید کی جاسکتی ہے کہ آنے والے عشروں میں مدینۃ الزہرا کی اصل آب و تاب کو کسی حد تک بحال کر دیا جائے گا۔

ابھی اس جگہ سے 90 فی صد کھدائی ہونا باقی ہے۔ لیکن دنیا کے کسی بھی شہر کی طرح قرطبہ بھی ہر سمت میں پھوڑے کی طرح پھول رہا ہے۔ ہسپانوی لینڈ مافیا مدینۃ الزہرا کی زمین کے اوپر رہائشی بستیاں تعمیر کرتی چلی جارہی ہے۔ سپین کی حکومت نے 1995ء میں ایک قانون منظور کیا تھا جس کے تحت اس علاقے میں ہر قسم کی تعمیرات ممنوع قرار پائی تھیں، لیکن نیویارک ٹائمز کی ایک

رپورٹ کے مطابق ممنوع زمین پر ڈھائی سو سے زیادہ غیر قانونی مکانات تعمیر کیے جا چکے ہیں، جن کی وجہ سے یہ خدشہ پیدا ہو گیا ہے کہ شاید مکمل شہر کبھی بھی بازیاب نہ کروایا جا سکے۔

....

میرا نام کاؤنٹ گونزالس ہے اور میرا تعلق شمالی سپین کی ریاست نوارے سے ہے۔ مجھے ایک وفد لے کر قرطبہ کے خلیفہ عبدالرحمٰن ثالث کی خدمت میں قرطبہ پیش ہونا تھا۔ چناں چہ میں سال 949 عیسوی میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ جزیرہ نما آئبیریا کے وسط میں واقع اموی خلافت کے مرکز قرطبہ پہنچا۔ صدر دروازے کے باہر ہمارا استقبال کیا گیا۔

سب سے پہلے تو ہمیں مسجدِ قرطبہ کی سیر کرائی گئی۔ مسجد کی عظمت و شکوہ اور اس کے اندر گہما گہمی دیکھ کر جو افسانے سنے تھے ان پر یقین آ گیا۔ اس کے بعد ہمیں قرطبہ کی گلیوں اور بازاروں سے گزارا گیا جہاں ریشم، اطلس اور جواہرات کی زرق برق دکانوں کے ساتھ ساتھ کتابوں کی بھی سینکڑوں دکانیں تھیں۔ آخر یہ قرطبہ تھا جو اپنی علوم و فنون، شعر و ادب اور ریاضی و فلکیات کے لیے مشہور تھا۔

اس وقت قرطبہ کی آبادی ایک لاکھ سے زیادہ ہے، جو اس دور کے لندن، پیرس اور روم کی مشترکہ آبادیوں سے بھی بڑھ کے ہے۔ دنیا میں صرف بغداد اور قسطنطنیہ دو ایسے شہر ہیں جو شان و شوکت میں قرطبہ کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ لیکن خلیفہ سے ملنے کے لیے ہمیں پانچ میل دور نئے بسائے گئے شہر مدینہ الزہرا جانا تھا۔

قرطبہ سے لے کر مدینہ الزہرا تک سڑک کے اطراف چمکیلی زرہ بکتر اور زرق برق وردیاں پہنے سپاہی قطاروں میں کھڑے تھے، جن کے ہاتھوں میں بے نیام تلواریں تھیں جو انھوں نے ہوا میں بلند کر رکھی تھیں۔ اس سے گلی میں ایک محراب سی بن گئی تھی۔ ہمارا وفد شمشیر ہائے آب دار کے سائے سائے مدینہ الزہرا کے صدر دروازے تک پہنچا جس کی وسعت اور عظمت بیان سے باہر ہے۔ دروازے کی چھت پتھر کے بڑے بڑے ٹکڑوں سے کاٹ کر مسجدِ قرطبہ کی آرائشی محرابوں کی طرز پر بنائی گئی تھی۔ اور دروازہ اس قدر بڑا تھا کہ اس سے رتھوں کی قطاریں با آسانی گزر سکتی تھیں۔

دروازے سے اندر کا منظر مبہوت کر دینے والا تھا۔ شاہی شہر ایک پہاڑی کے اوپر پھیلا ہوا تھا۔ سورج کی کرنیں شہر کی عمارتوں کے دروازوں پر لگی چاندی کی کنڈیوں سے منعکس ہوتی تھیں۔

ہم اپنے محافظوں کے جلو میں ہرے اور نیلے رنگ کی ٹائلوں سے بنی سڑک پر چلتے گئے جس کے دونوں اطراف سنگِ مرمر کی دیواریں تھیں۔

شاہی محل سے پہلے گزوں تک کم خواب کے قالین بچھے ہوئے تھے۔ محل کے باہر سرخ ریشم میں ملبوس، سروں پر جڑاؤ پگڑیاں باندھے، سونے کے پیش قبضوں والی تلواریں باندھے ہوئے درباری گھوم پھر رہے تھے۔ ایک عالی شان کمرے میں بلند کرسیوں پر ریشم واطلس میں ملبوس شہر کے عمائد اس شاہانہ کروفر سے بیٹھے تھے کہ ہمارے وفد کے بعض ارکان انھیں خلیفہ سمجھ کر جھک گئے۔ لیکن ہمارے راہبر نے آواز لگائی، 'سر اٹھایئے، کہ یہ تو خلیفہ کے ملازموں کے ملازم ہیں'۔

اگر کوئی کسر رہ گئی تھی تو وہ سفیروں کے بڑے استقبالیہ ہال میں پہنچ کر پوری ہوگئی۔ اس عظیم الشان ہال کے اوپر چھت نہیں تھی۔ منقش مرمریں دیواروں پر لٹکے ہوئے ریشمی پردے ہوا میں ہولے ہولے جھول رہے تھے۔ فرش پر بچھے قالینوں پر ایسے خوش نما نقش بنے ہوئے تھے کہ ان پر چلتے ہوئے بے ادبی کا احساس ہوتا تھا۔ دیواروں میں بنی محرابی کھڑکیوں سے باہر دور تک وسیع سبزہ زار پھیلا ہوا تھا جس میں فوارے رواں تھے۔ ایک طرف مجھے ہرنوں کی ایک ڈار چوکڑی بھرتی نظر آ گئی۔

ہال کے بیچوں بیچ ایک بہت بڑا طشت پارے سے بھرا پڑا تھا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے جب ہوا کے جھونکے سے پارے کی سطح مرتعش ہوئی تو ہال کی چھت اور دیواروں پر جڑے قیمتی پتھروں اور شیشوں میں بننے والے عکس میں رنگوں اور روشنیوں کا بھونچال آ گیا، جس نے ہماری آنکھیں چندھیا کر رکھ دیں۔

ہال بالکل خالی تھا۔ ہال سے گزر کر آگے پہنچے تو وہاں ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس کی دیواریں بغیر پلستر کے سادہ اینٹوں سے بنی ہوئی تھیں۔ فرش پر ریت بچھی ہوئی تھی۔ کمرے کے بیچوں بیچ ایک شخص پیوند لگی گدڑی اوڑھے ہوئے بیٹھا تھا جس نے چولہے میں آگ جلا رکھی تھی اور وہ اس میں پھونکیں مار کر شعلے بھڑکانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ساتھ ہی ایک رحل پر قرآن رکھا ہوا تھا جس کے پیچھے ایک تلوار پڑی تھی۔

یہ اندلس کی تاریخ کا سب سے عظیم شہنشاہ خلیفہ المومنین عبدالرحمٰن ثالث تھا۔

....

عبدالرحمٰن ثالث کا عہدِ حکومت اندلس کی تاریخ کا سنہرا دور کہلاتا ہے۔ عرب مصنفین اس کی تعریف میں پروپیگنڈے کی حد تک پہنچ جاتے ہیں۔ اپنے انچاس سالہ اقتدار میں اس نے اندلس کو ایک مستحکم اور خوش حال ریاست بنانے میں زبردست کامیابی حاصل کی تھی۔ اس کے اعتماد اور تیقن کی ایک واضح مثال 929ء کو جنوری کے ایک جمعے کے دن دیکھنے میں آئی جب مسجدِ قرطبہ میں نماز پڑھنے کے لیے ہزاروں کی تعداد میں نمازیوں کے مجمعے نے خطبے میں خلیفۂ بغداد کی بجائے عبدالرحمٰن ثالث کا نام سنا۔ اس سے پہلے اگرچہ اندلس خود مختار تھا اور اس کے تعلقات عباسیوں سے مخاصمانہ تھے، لیکن اس کے باوجود اندلس کی حیثیت خلافتِ عباسیہ کا ایک صوبے کی سی تھی، اور اس کے حکمران امیر کہلاتے تھے۔ لیکن عبدالرحمٰن ثالث کے نام سے خطبہ جاری ہونے کا مطلب یہ تھا کہ اندلس اب مکمل طور پر عباسیوں کے تسلط سے آزاد ہو چکا ہے اور یہ کہ امتِ اسلامیہ صرف بغداد ہی میں مرکوز نہیں۔ خلافت کا وہ حق جو عبدالرحمٰن اول اپنے خون میں لے کر قرطبہ پہنچا تھا، اب نسل در نسل عبدالرحمٰن ثالث کو منتقل ہو چکا ہے۔ عبدالرحمٰن نے اسی حق کی برسرِ منبر تشہیر کروا کے دنیا کو باور کرانا چاہا کہ اب اندلس بغداد کی سپر پاور کو آنکھیں دکھانے کے قابل ہو چکا ہے۔

لیکن عبدالرحمٰن ثالث جانتا تھا کہ کھوکھلے دعووں سے کچھ نہیں بنتا۔ بغداد کا ہم پلہ بننے کے لیے فوجی طاقت کے علاوہ علوم وفنون میں بھی ترقی کی ضرورت ہے۔ چناں چہ خلیفہ بننے کے بعد اس نے سب سے پہلا کام جو کیا وہ قرطبہ کے نواح میں ایک نئے شہر کی تعمیر تھی۔ بالکل ایسے ہی جیسے کبھی اس کے اموی آبا نے دمشق سے باہر اور عبدالرحمٰن اول نے قرطبہ سے باہر رصافہ تعمیر کروایا تھا۔

عبدالرحمٰن ایک عام دارالخلافہ نہیں بسانا چاہتا تھا، اس سلسلے میں اس کے عزائم کا سر بادلوں سے ٹکراتا تھا۔ برسوں کی منصوبہ بندی، نقشہ سازی اور مناسب محلِ وقوع کی چھان بین کے بعد 936ء میں مدینۃ الزہرا پر کام شروع ہو گیا۔ مشہور ہے کہ شہر کا نام خلیفہ کی محبوب ملکہ کے نام پر رکھا گیا تھا۔ گویا آپ کو اس کو بڑے پیمانے پر تاج محل بھی سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن جدید دور کے بعض ماہرین نے خیال ظاہر کیا ہے کہ اس شہر کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ زہرا کا مطلب 'کھلتا ہوا پھول' ہے۔ شہر کے قریب ایک پہاڑی پر انتہائی خوش بودار پھولوں کے قطعات دور تک پھیلے ہوئے تھے، جسے جبل الوردہ یا پھولوں کا پہاڑ کہا جاتا تھا۔

مدینۃ الزہرا پہاڑی پر بسایا گیا تھا، اس کے تین درجے تھے، سب سے نیچے عام شہریوں اور

سپاہ کے گھر تھے۔ ان سے ایک منزل کی اونچائی پر انتظامیہ کے دفاتر اور رؤسا اور درباریوں کے محلات تھے، جب کہ سب سے اوپر شاہی محل 'دارالملک' تھا۔ شہر کے باغات کے اندر مختلف ممالک سے نایاب درخت لا کر اگائے گئے تھے۔ باغات اور شہر کے لیے بہت دور سے رومی طرز کے ستونوں پر قائم نہروں کے ذریعے پانی لایا گیا تھا۔

مدینہ الزہرا کی تعمیر میں دس ہزار مزدوروں اور ڈھائی ہزار خچروں نے حصہ لیا تھا۔ اس شہر کے اندر سنگِ مرمر کے 4300 ستون تھے جنھیں شمالی افریقہ اور اٹلی سے درآمد کیا گیا تھا۔ 140 ستون بازنطینی شہنشاہ قسطنطین ہفتم نے تحفتاً عنایت کیے تھے۔ محلات کی دیواریں سنگِ یشپ، ہاتھی دانت اور آبنوس سے بنے نقش و نگار سے مزین تھیں۔ سنگِ سبز سے بنا ایک فوارہ شام سے منگوایا گیا تھا جس کے گرد بارہ جانوروں کے طلائی مجسمے ایستادہ کیے گئے تھے جن پر موتی اور جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ یہ مجسمے مقامی طور پر تیار کیے گئے تھے اور ان میں مگرمچھ، مرغے، عقاب، اژدھے، فاختہ، اور بطخ کے مجسمے شامل تھے۔

جب شہر مکمل ہوا تو اس میں 400 عمارتیں تھیں، جن میں محلات، مساجد، باغات، بازار، دفاتر، رہائشی مکانات، سرائیں، سکول، ورکشاپیں، حتیٰ کہ ایک چڑیا گھر تک شامل تھے۔ یہ دنیا کا پہلا شہر ہے جس کے نقشے میں سیورج سسٹم کا خیال رکھا گیا تھا۔ تمام شہر کے نیچے ایک زیرِ زمین نالا چلتا تھا جو آلائشیں اکٹھی کر کے شہر سے باہر نکال دیتا تھا۔ اپنے عروج کے زمانے میں یہاں کل 14 ہزار افراد رہائش پذیر تھے۔

لیکن مدینہ الزہرا صرف تعمیراتی عجوبہ ہی نہیں تھا۔ یہیں علم و فنون کے چشمے پھوٹتے تھے۔ ازمنۂ وسطیٰ کے مشہور ترین سرجن الزہراوی نے یہیں بیٹھ کر جراحی کے آلات تخلیق کیے تھے جو بیسویں صدی تک مغرب میں استعمال ہوتے رہے۔ اندلس کا سب سے بڑا شاعر ابنِ حزم مدینہ الزہرا کے محلات ہی میں پلا بڑھا تھا۔

جیسا کہ تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے، مادی اور ثقافتی ترقی اس وقت تک ممکن نہیں ہوتی جب تک اسے معیشت کی مضبوط پشت پناہی حاصل نہ ہو۔ دسویں صدی عیسوی کے اندلس کے اس خیرہ کن جاہ و جلال کی بنیاد ملک کی ثروت مندی تھی۔ عربوں نے مشرقِ وسطیٰ کے صحراؤں میں پانی کو مسخر کرنے کے طریقے سیکھے تھے، وہ آب پاشی کی یہ جدید ترین ٹیکنالوجی ساتھ لے کر آئے تھے

جس نے جزیرہ نما ہسپانیہ کی سرزمین کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔ وہ علاقے جہاں سالوں بعد بارشیں ہوتی تھی، نہری جال کی مدد سے سونا اگلنے لگیں۔ چناں چہ آج بھی ہسپانوی زبان عربی کی زرعی اصطلاحات سے مالا مال ہے۔

قرطبہ کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کی گہما گہمی کی ایک بڑی وجہ اس کے باشندوں کی علم دوستی تھی۔ قرطبہ اس وقت بالکل ایسے ہی دنیا کا مرکز تھا، جیسے نویں صدی میں بغداد، انیسویں صدی میں پیرس اور بیسویں صدی میں لندن دنیا کے مرکز تھے۔ سترھویں صدی کا عرب تاریخ داں المقری لکھتا ہے:

> 'قرطبہ چار چیزوں میں دنیا بھر سے آگے تھا، الزہرا کے شاہی محلات، دریائے الکبیر پر تعمیر کردہ پل، مسجدِ قرطبہ اور ان سب سے بڑھ کر علم و فضل۔'

اس علم وفضل کی فراوانی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں نے آٹھویں صدی کے وسط ہی میں چینیوں سے کاغذ بنانے کا فن سیکھ لیا تھا۔ انھوں نے ویلنسیا کے ساحلی شہر کے قریب جیٹیوا (عربی: شاطبہ) کے مقام پر کاغذ بنانے کا کارخانہ قائم کیا تھا جہاں کپاس سے کاغذ بنایا جاتا تھا۔ چمڑے کو تحریر کے قابل بنانا بے حد وقت طلب اور مہنگا مشغلہ تھا۔ چناں چہ اکثر اوقات پہلے سے موجود چمڑے پر لکھی گئی کتابوں کو دھو کر ان پر نئی کتابیں تحریر کی جاتی تھیں۔

عبدالرحمٰن ثالث کا جانشین خلیفہ حکم ثانی بھی علم ودانش کا دل دادہ تھا۔ اس کے ذاتی کتب خانے میں چار لاکھ سے زائد کتابیں موجود تھیں۔ اس کے مقابلے پر سوئٹزرلینڈ میں واقع بقیہ یورپ کے سب سے بڑے کتب خانے میں صرف چار سو کتابیں تھیں جو بھیڑ یا بکری کی کھال پر لکھی گئی تھیں۔

حکم ثانی کی لائبریری کا صرف کیٹلاگ چوالیس جلدوں پر محیط تھا۔ کتاب دوست خلیفہ نے ایجنٹ مقرر کر رکھے تھے جو دنیا بھر سے اس کے لیے کتابیں خرید کر لاتے تھے۔ کتب خانہ صرف خلیفہ تک محدود نہیں تھا بلکہ اس سے استفادہ کرنے کے لیے ہر کسی کو صلائے عام تھی۔ خلیفہ نادار طلبا کو وظائف بھی فراہم کیا کرتا تھا۔

یہ وہ معاشرہ تھا جہاں مسلم، عیسائی اور یہودی نہ صرف ساتھ ساتھ رہتے تھے، بلکہ ہر دو اہلِ کتاب کو مکمل مذہبی آزادی حاصل تھی۔ عبدالرحمٰن کا وزیر ایک یہودی ہسدائی بن شپروُت تھا، جس

کا شمار یہودی تاریخ کے عظیم ترین دانش وروں میں کیا جاتا ہے۔ ہسدائی نہ صرف داخلی امورِ سلطنت میں اہم کردار ادا کرتا تھا، بلکہ اسے وزیرِ خارجہ کی حیثیت بھی حاصل تھی۔

جیسے عبدالرحمٰن نے بغداد کے ساتھ ڈور توڑ کر اپنی تازہ بستی بسائی تھی، ویسے ہی ہسدائی نے بھی یہودیت کا مرکز بابل سے اندلس منتقل کر دیا اور اب یہودیوں کے تمام مذہبی معاملات، تہواروں کی تواریخ کا تعین اور قانونی مسائل کی توجیہ و تعبیر قرطبہ سے ہونے لگی۔

ہسدائی نے سن رکھا تھا کہ وسطی ایشیا میں یہودیوں کی ایک طاقت ور سلطنت آباد ہے جس کا نام خضر ہے۔ اس نے خضر کے بادشاہ کے نام خطوط لکھے جن میں اس نے اندلس کی عظمت کے گن گائے ہیں:

> جنابِ والا: سب سے پہلے یہ جان لیں کہ ہماری سرزمین مقدس عبرانی میں سیفرارید کہلاتی ہے، جب کہ اس کے اسماعیلی باسی (یعنی مسلمان) اسے اندلس کہہ کر پکارتے ہیں۔ اس کے دارالحکومت کا نام قرطبہ ہے۔ یہ غلے، شرابوں اور خالص مٹی کی سرزمین ہے۔ یہاں پودوں کی بہتات ہے اور یہ ملک ہر طرح کی مٹھاس کی جنت ہے۔ اس کے باغوں میں ہر قسم کا پھل اگتا ہے۔ یہاں ایسے درخت ہیں جس کے پتوں میں ریشم کا کیڑا اپلتا ہے۔ ہم اپنی سرزمین کے پہاڑوں سے سونے، چاندی، تانبے، لوہے، قلعی، سرمہ، بلور اور سنگِ مرمر نکالتے ہیں۔ ہمارے بادشاہ کا خزانہ سونے، چاندی اور جواہرات سے لبالب ہے اور اس کی فوج کی کثرت کا یہ عالم ہے کہ نہ پہلے کبھی دیکھی گئی نہ سنی گئی۔ جب دوسرے ملکوں کے والی ہمارے بادشاہ کی شان و شوکت کے بارے میں سنتے ہیں تو اس کی خدمت میں نذرانے پیش کرتے ہیں۔

....

اس وقت کون کہہ سکتا تھا اس عروس البلاد، اس زیورِ دنیا کی شان و شوکت کے اندر ہی اس کی خرابی مضمر ہے جو چند عشروں کے اندر اندر اسے جلا کر راکھ کر ڈالے گی؟

کیسی بلندی کیسی پستی

لڑتے لڑتے وہ وقت آ گیا جب مجھے احساس ہو گیا کہ اس جنگ کو طول دینا ایسا ہی ہے جیسے کوئی طبیب بسترِ مرگ پر پڑے ہوئے مریض کی جاں کنی کے لمحات بلا وجہ دراز کرتا چلا جائے۔ میرے دو بیٹے مارے جا چکے تھے اور بچے کھچے سپاہی راہِ فرار اختیار کر رہے تھے۔ میرے ان کمان داروں اور سپہ سالاروں کا کوئی اتا پتا نہیں تھا جو آخری وقت تک ساتھ نبھانے کی قسمیں کھاتے نہیں تھکتے تھے۔ دشمن کے سپاہی محل کی دیواریں پھلانگ پھلانگ کر احاطے میں کود رہے تھے۔ محل کے ایک کونے سے دھویں کے مرغولے اٹھ رہے تھے۔ ہر طرف چیخ پکار مچی ہوئی تھی۔ دائرہ ہر لمحے تنگ ہوتا چلا جا رہا تھا۔

میں نے اپنی زرہ بکتر اتار دی، سر سے خود ہٹا کر پرے پھینکا اور تلوار سونت کر بربروں کے ایک جتھے میں کود گیا۔ میدانِ جنگ میں کام آنا ہی جنگجوؤں کی زندگی کی معراج ہوا کرتی ہے۔ لیکن میرے قریب پہنچتے ہی انھوں نے ہتھیار روک دیے اور کمندیں پھینک کر مجھے جکڑ لیا۔

جب آنکھوں کی برسات تھم گئی
اور دل پر خاموشی کے گہرے بادل چھا گئے
میں نے آوازیں سنیں:
'ہتھیار ڈال دو، اسی میں دانائی ہے!'
میں نے جواب دیا:
'شرمندگی کی شراب کے پیالے سے
زہر کا گھونٹ بہتر ہے'

....

سیاہ بیل کی گردن سے خون کی دھاریں بہہ بہہ کر اکھاڑے کی مٹی میں جذب ہو رہی تھیں۔ بیل کے کندھوں پر تین برچھے پرچموں کی طرح گڑے ہوئے تھے۔ گردن کے پٹھے زخمی ہونے کی وجہ سے وہ سر اوپر نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اس نے سر جھکائے جھکائے ہی اپنے دشمن کی طرف دیکھا۔ انتقام، انتقام۔ اس کی چھوٹی چھوٹی بھوری آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ محاورتاً بھی اور حقیقتاً بھی، کیوں کہ سر جھکائے رکھنے کی وجہ سے خون کی ایک دھار سیدھی چہرے پر آ رہی تھی۔ اس کا تو حال ہوا سو ہوا، وہ اپنے دشمن سے بدلہ لے کر رہے گا۔ اس نے اپنی آخری قوت مجتمع کی اور گردن کے پٹھے سکیڑ کر دشمن پر جھپٹ پڑا۔

دشمن نے جھکائی دے کر اپنا سرخ کپڑا بیل کے آگے کر دیا۔ یہ دشمن بھی ایک ہی کائیاں تھا۔ چھریرا بدن، درمیانہ قد، پرسکون انداز، جیسے وہ اپنے خون کے پیاسے بارہ من وزنی مرکھنے بیل کے سامنے نہیں کھڑا بلکہ اپنے گھر کے لان میں چہل قدمی کر رہا ہے۔ ہر بار جھکائی دینے کے بعد وہ ہجوم کی طرف یوں دیکھتا تھا جیسے کسی مشاعرے میں شاعر اپنی دانست میں حاصلِ غزل شعر پڑھ کر تھوڑی دیر کا توقف کرتا ہے تاکہ سامعین کو داد و تحسین کے ڈونگرے برسانے کا پورا موقع مل سکے۔

بیل اپنی جھونک میں آگے چلا گیا تھا۔ بڑی مشکل سے سنبھالا لیا اور گھوم کر رخ دوبارہ دشمن کی طرف کر لیا۔ ہر حرکت کے ساتھ گردن میں گڑے برچھے بدن کے اندر گھسے جاتے تھے۔ بالٹی بھر خون ضائع ہو چکا تھا۔ طاقت ایک چوتھائی رہ گئی تھی۔

کاش یہ لہراتا ہوا بدنما پردہ درمیان سے ہٹ جائے اور وہ اپنے تیز دھار اور لمبے سینگ اپنے دشمن کے سینے میں کھبو سکے۔ اس کے جسم کو اپنے کھروں تلے روند سکے۔ مرتے مرتے اگر وہ حریف کو بھی مزا چکھا سکے تو اپنے مرنے کا زیادہ غم نہیں ہوگا۔

....

لیکن اس سے پہلے کہ میں آگے کا احوال بتاؤں، بہتر ہے کہ پہلے اپنا تعارف کروا دوں۔ میرا نام محمد ابن عباد ہے، لیکن تاریخ مجھے معتمد کے نام سے جانتی ہے۔ میں نے اشبیلیہ پر 1059ء سے 1091ء تک اس شان سے حکومت کی تھی کہ میری سلطنت کی ٹکر کی اندلس بھر میں کوئی اور ریاست نہیں تھی۔

ذہن میں یادوں کے جھکڑ چل رہے ہیں۔ بیتے ہوئے دن ایک ایک کر کے آنکھوں کے

سامنے سے گزرتے چلے جا رہے ہیں۔ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کہاں سے ابتدا کی جائے۔ لیکن ایک خوب صورت شام کا منظر ذہن پر ابھرا ہے، اس کا قصہ سنیے۔

ایک دن میں اور میرا عزیز دوست ابنِ عمار شام کے وقت دریائے وادی الکبیر کے کنارے چہل قدمی کے لیے نکلے۔ ابھی سردیوں کا آغاز نہیں ہوا تھا، لیکن ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی رچی ہوئی تھی۔ ابنِ عمار میری ہی عمر کا تھا اور نہایت عمدہ شاعر تھا۔ وہ میرا دوست، میرا ہم راز، میرا ہم نوالہ و ہم پیالہ ہونے کے ساتھ ساتھ میرا وزیر بھی تھا۔

ہم باتیں کرتے اور شعر پڑھتے ہوئے جا رہے تھے۔ قریب ہی کچھ عورتیں دریا کے کنارے کپڑے دھو رہی تھیں۔ خاموشی سے بہتے ہوئے وادی الکبیر کے مٹیالے پانی میں سورج جاتے جاتے اپنی سرخیاں منعکس کر رہا تھا۔ ہوا دریا کی سطح پر اٹکھیلیاں کر رہی تھی۔ میں نے ایک فی البدیہہ مصرع موزوں کر کے ابنِ عمار کو سنایا:

صنع الریح من الماء زرد

(پانی کی سطح پر ہوا سے زنجیروں کی مانند لہریں بن اور مٹ رہی ہیں)

اور اسے کہا کہ وہ اس مصرعے پہ مصرع لگا کر شعر مکمل کرے۔ ابنِ عمار بے حد فطین اور حاضر جواب شاعر تھا اور ایسے معاملات میں اس کا ذہن بجلی کی طرح چلتا تھا۔ لیکن نہ معلوم کیا ہوا کہ اس موقعے پر اسے ذرا دیر لگ گئی۔ ابھی وہ دوسرے مصرعے کی فکر میں غرق تھا کہ کپڑے دھونے والی عورتوں میں سے ایک نے آواز لگائی:

ایّ درع لقتالٍ لو جمد

(اگر جم جائیں تو جنگ کے لیے کیا خوب زرہ بکتر بن جائے)

میں ٹھٹک کر رک گیا۔ مڑ کر شعر پڑھنے والی کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ سرو قد، آنکھوں میں ذہانت آمیز شوخی، اور چہرہ شفق کے رنگوں سے گلنار۔ اس کا نام اعتماد تھا اور وہ رمیک نامی شخص کی کنیز تھی، جس کی وجہ سے رمیکیہ کے نام سے جانی جاتی تھی۔ قصہ مختصر، یہی اعتماد بعد میں میری ملکہ بنیں اور انھی کے نام کی مناسبت سے میں نے اپنا نام 'معتمد' رکھ لیا، یعنی وہ جس پر اعتماد کیا جا سکے۔

....

گھائل بیل نے بچی کھچی ہمت اکٹھی کی اور دوبارہ دشمن پر جھپٹ پڑا۔ اس بار دشمن کے

ارادے مختلف تھے۔ اس نے بائیں ہاتھ میں تھامی ہوئی پتلی تلوار تیزی سے دائیں ہاتھ میں منتقل کی اور پوری قوت سے اسے بیل کے کندھے میں گاڑنے کی کوشش کی۔ بہتے خون کے باعث جلد پھسلواں تھی۔ وار چھچھلتا ہوا پڑا اور تلوار زمین پر گر پڑی۔ دس ہزار تماشائیوں نے زور سے نعرہ لگا کر دشمن مذاق اڑایا۔ اسی دوران دشمن کے کئی ساتھی میدان میں آ گئے اور بیل کو اپنے اپنے پردے لہرا لہرا کر اکسانے لگے۔ دشمن اکھاڑے کے ایک کونے کی طرف بڑھا اور ایک اور پتلی تلوار لے کر دوبارہ بیل کے بالمقابل آ گیا۔ بیل نے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے پھر یلغار کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کوشش میں اعتماد کی بجائے شکست خوردگی زیادہ نمایاں تھیں۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ بازی مات ہو چکی ہے۔

اب کے دشمن کا وار خالی نہیں گیا۔ تلوار کندھے میں اتر کر سیدھی دل تک پہنچ گئی۔ تلوار کا صرف دستہ باہر رہ گیا۔ ہجوم نے جوش سے 'اولے' کا نعرہ بلند کیا۔ بیل لڑکھڑا کر اگلے قدموں پر ڈھے گیا۔ دشمن چاروں طرف گھوم گھوم کر تماشائیوں کی تالیوں کا جواب دینے لگا۔

....

لیکن صاحب، یہ ملکہ اعتماد تھیں بڑی متلون مزاج، گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ۔ طبیعت کی ایسی ضدی کہ کسی بات پر اڑ جائیں تو دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے، یہ ٹس سے مس نہ ہوتی تھیں۔ ایک دفعہ تو انھوں نے حد ہی کر دی۔ سردیوں کے دن تھے۔ ویسے تو قرطبہ برفانی شہر نہیں ہے، لیکن اس سال اتفاق سے وہاں برف گرنا شروع ہو گئی۔ ہم مسجد کے قریب واقع اپنے محل میں اوپری منزل پر بیٹھے ہوئے تھے۔ منقش جھروکے سے باہر کا منظر دل موہ لینے والا تھا۔ برف کے گالے جھومتے، لہراتے ہوئے زمین پر گر رہے تھے اور دور پہاڑیاں برف سے براق ہو گئی تھیں۔ یہ خوش نما منظر دیکھتے دیکھتے اعتماد کی دل کش مسکراہٹ کے خطوط اداسی کے زاویوں میں ڈھل گئے اور ذرا ہی دیر میں زار و قطار آنسو رواں ہو گئے۔ میں ہکا بکا رہ گیا۔ بار بار پوچھا، ارے بھئی کیا ہوا؟ کچھ بتاؤ تو سہی، لیکن ملکہ ہیں کہ جواب ہی نہیں دے رہیں۔

آخر بڑی مشکل سے ہچکیوں کے دوران بتایا کہ آپ کتنے ظالم ہیں کہ ایسا منظر مجھے ہر سال نہیں دکھاتے۔ میں نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کہ بھئی میں لاکھ مطلق العنان بادشاہ سہی، لیکن میرا موسموں پر کوئی اختیار نہیں، میں برف نہیں برسا سکتا۔ لیکن ملکہ اعتماد ضد پر اڑ جائیں تو کوئی

کیا کر سکتا ہے۔

لیکن کسی نہ کسی طرح ملکہ کو مطمئن کرنا بھی ضروری تھا۔ آخر بڑی سوچ بچار اور ماہرین سے مشورے کے بعد میں نے قرطبہ کی آس پاس کی تمام پہاڑیوں کو بادام کے درختوں سے ڈھک دیا۔ اب جب بھی اوائل بہار میں ان درختوں پر شگوفے پھوٹتے، دور سے ایسا لگتا جیسے یہ پہاڑیاں برف سے لدی ہوئی ہیں، اور اعتماد صاحبہ مسرور ہو جایا کرتی تھیں۔

....

یہ روداد ہے اس بل فائیٹنگ میچ کی جو ہم نے اشبیلیہ میں دیکھا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اشبیلیہ میں آ کر بل فائیٹنگ نہ دیکھی تو گویا اصل اشبیلیہ ہی نہیں دیکھا۔ اس لیے ڈان ہوان نے اشبیلیہ پہنچنے کے بعد سب سے پہلا کام یہی کیا کہ ہمیں دنیا کے نہ صرف مشہور ترین بلکہ قدیم ترین بل فائٹنگ سٹیڈیم رایال مائسترانسا لے گیا۔ دریائے الکبیر کے کنارے واقع یہ بل رنگ ڈھائی سو سال پرانا ہے۔

بل رنگ ایک سٹیڈیم کی شکل میں ہے، جس میں ہزاروں تماشائیوں کے بیٹھنے کی گنجائش موجود ہے۔ ایک طرف شاہی خاندان کے لیے مخصوص جھروکا ہے جہاں ڈان ہوان کی اطلاع کے مطابق شاہی خاندان کبھی کبھار جلوہ افروز ہوتا ہے۔ رنگ کے اندر نشستیں تین حصوں میں تقسیم کی گئی ہیں۔ شیڈ کے نیچے والے حصے کا ٹکٹ سب سے مہنگا ہے، جب کہ دھوپ والی سیٹیں سستی ہیں۔ سب سے اونچی نشستوں کے اوپر رنگ محرابوں ایک طویل سلسلہ ہے جس نے تمام رنگ کو حصار میں لے رکھا ہے۔ رنگ میں جگہ جگہ مشہور بل فائٹروں کے مجسمے نصب کیے گئے ہیں، حتیٰ کہ رنگ کی چھت بھی مجسموں سے عاری نہیں۔ نشستوں کے نیچے ایک میوزیم بھی بنایا گیا ہے جس میں مشہور بل فائیٹروں کے مجسمے، تلواریں، لباس اور تصاویر نمائش کے لیے رکھے گئے ہیں۔

بہت عرصے سے جانوروں کے حقوق کے علم بردار بل فائیٹنگ کو بند کروانے کے لیے کوشاں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ تماشائیوں کی تفریح کے لیے کسی جانور کو یوں تڑپا تڑپا کر مارنا غیر انسانی فعل ہے۔ اس کے مقابلے پر بل فائیٹنگ کے حامیوں کا دعویٰ ہے کہ یہ کھیل نہیں بلکہ فنونِ لطیفہ کی ایک قسم ہے۔ بل فائٹر ایک فن کار ہوتا ہے جو سخت اصولوں کے اندر رہ کر کسی مصور یا موسیقار کی طرح اپنے فن کا مظاہرہ کرتا ہے۔

اشبیلیہ کے مائسترانسا میوزیم سے معلوم ہوتا ہے کہ بل فائٹنگ ہسپانوی کلچر کا لازمی حصہ ہے اور سخت مخالفت کے باوجود مستقبل قریب میں مشکل نظر آتا ہے کہ اس پر پابندی عائد کی جا سکے۔

....

خیر، میں باتوں باتوں میں یہ بتانا بھول گیا کہ ویسے تو میری سلطنت اشبیلیہ میں قائم تھی، لیکن میں تخت سنبھالنے کے دوسرے ہی برس قرطبہ پر اپنا جھنڈا لہرانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہ اندلس بھر میں نہایت پرآشوب زمانہ تھا۔ 1031ء میں قرطبہ کی مرکزی خلافت کے پارہ پارہ ہونے کے بعد ملک درجنوں چھوٹی بڑی ریاستوں میں بٹ گیا تھا، جنھیں طائفے کہا جاتا تھا، اور اس زمانے کو طوائف الملوکی کا دور۔ یہ طائفے چھوٹی سے چھوٹی بات پر ایک دوسرے کے خلاف تلوار سونت کر کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔

مسلم ریاستوں کی خودکشانہ آویزش سے فائدہ اٹھا کر شمال میں واقع عیسائی ریاستوں کی ہمت بندھی۔ انھوں نے حملے کر کے چھوٹی موٹی ریاستوں کو ہڑپ کرنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ قشتالیہ کے امیر الفانسو ششم نے اتنا زور پکڑا کہ بہت سی مسلم ریاستیں اسے خراج دینے پر مجبور ہو گئیں۔ 1085ء میں الفانسو نے طلیطلہ پر قبضہ کر لیا۔ طلیطلہ گذشتہ تین سو برس سے مسلم علوم وفنون کا گڑھ تھا۔ اس کے سقوط سے اندلس بھر میں خطرے کی گھنٹی بج گئی، اور تمام ریاستوں کو اندازہ ہو گیا کہ ان کے دن گنے جا چکے ہیں اور وہ جلد یا بدیر الفانسو کی سلطنت کا حصہ بن جائیں گے۔ اب ہمارے سامنے دو ہی راستے تھے۔ یا تو الفانسو کے سامنے گھٹنے ٹیک دیں اور یا پھر شمالی افریقہ کی المرابطون سلطنت کو مدد کے لیے پکاریں۔

اس موقعے پر میں نے ایک شعر کہا تھا جس پر ہمیشہ افسوس رہے گا:

میں قشتالیہ میں عیسائیوں کے سور چرانے پر
فاس میں بربروں کے اونٹ ہنکانے کو ترجیح دوں گا

خیر، میں نے غرناطہ کے امیر سے مشورہ کیا، دوسرے زعما سے بھی صلاح لی، جس کے بعد ہم سب نے اپنے اپنے سفرا مراکش بھیج کر بربر سلطان یوسف بن تاشفین سے مدد کی درخواست کی، جسے اس نے بخوشی قبول کر لیا۔ اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یوسف بن تاشفین

کی مدد دودھاری تلوار ہے۔

....

قرطبہ میں ایک رات ٹھہر کر ہم کل صبح اشبیلیہ کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ دونوں شہروں کا فاصلہ کوئی ڈیڑھ سو کلومیٹر ہے۔ بس میں ہر مسافر کی اپنی اپنی جگہ مخصوص تھی۔ میں بھی بس میں داخل ہو کر ڈائری میں اپنے تاثرات لکھنے بیٹھ گیا۔ طویل سفر کے بعد کچھ مسافروں سے جان پہچان ہو گئی تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ میرے سامنے والی سیٹ پر براجمان برازیلی سیاح خاتون جوزیفائن اور اس کا خاوند بڑی حیرت اور اشتیاق سے میری تحریر دیکھ رہے ہیں۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو وہ کہنے لگی، 'مجھے بڑی حیرت ہے کہ کوئی دائیں سے بائیں کیسے لکھ سکتا ہے۔ میں نے پہلی بار کسی کو اس قسم کی تحریر لکھتے دیکھا ہے۔ آخر یہ کون سی زبان ہے؟'

جب میں نے بتایا کہ اردو تو وہ بولی، 'معمول کی تحریر کی بجائے دائیں سے بائیں لکھنا تھوڑا غیر فطری اور عجیب سا نہیں لگتا؟'

میں نے کہا، 'غیر فطری تو بائیں سے دائیں لکھنا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نوے فی صد لوگ دائیں ہاتھ سے لکھتے ہیں۔ جب دائیں ہاتھ سے لکھنے والا انگریزی لکھتا ہے تو وہ اپنے ہاتھ کو کاغذ کے دائیں طرف سے بائیں طرف لے کے جاتا ہے، پھر وہاں سے واپس دائیں طرف لے کر آتا ہے۔ جب کہ اس کے مقابلے پر اردو لکھنے والا دائیں طرف ہی سے شروع کرتا ہے، جو ظاہر ہے، زیادہ فطری عمل ہے۔'

معلوم نہیں میری یہ تشریح جوزیفائن کے دل کو لگی یا نہیں، البتہ اس نے اس بارے میں مزید بحث نہیں کی۔

ابھی اشبیلیہ خاصی دور تھا۔ میں بیٹھا ہوا اس شہرِ قدیم کے بارے میں سوچنے لگا۔ اشبیلیہ، جنوبی سپین کا ثقافتی اور تہذیبی گڑھ۔ فلیمنکو کا مرکز۔ سارہ قوطیہ، ابن العربی، ابنِ رشد اور شاعرِ دل نواز المعتمد کا شہر۔ ابنِ خلدون اسی شہر میں سفیر بن کر آئے تھے اور یہیں سے کولمبس نے نئی دنیا دریافت کرنے کا بیڑا اور بیڑا اٹھایا تھا۔

لیکن ہماری بس جس اشبیلیہ میں داخل ہوئی، وہ بہت صاف ستھرا اور نیا نکور شہر تھا۔ سڑک کے دونوں طرف خوب صورت رہائشی عمارتیں بنی ہوئی تھیں، جن کے نیچے جدید ساز و سامان سے

بھری ہوئی دکانیں چمک دمک رہی تھیں۔ یہ نظارہ میری توقعات سے اس قدر مختلف تھا کہ مجھے گائیڈ ڈان ہوان سے تصدیق کرنا پڑی کہ واقعی یہی اشبیلیہ یا سیویا(Seville) ہے۔

یہاں پر ایک گھپلا یہ ہوا کہ ہمارے ٹور کو دو مختلف ہوٹلوں میں ٹھہرایا گیا۔ انگریزی بولنے والے تمام سیاح دوسرے ہوٹل میں چلے گئے، جب کہ میرے حصے میں صرف ہسپانوی بولنے والے آئے۔ ڈان ہوان سے گلہ کیا تو وہ کہنے لگا کہ ہوٹلوں کی بکنگ بہت پہلے ہی سے ہو چکی ہے اور اب اس میں کسی قسم کی تبدیلی ممکن نہیں ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے پیش کش کر دی کہ اگر کسی بھی وقت انگریزی بولنے کی ضرورت پیش آئے تو اس کی خدمات حاصل کی جا سکتی ہیں۔

....

یوسف بن تاشفین کی فوج 1086ء میں آبنائے جبل الطارق پار کر کے اندلس میں داخل ہو گئی۔ میں نے ساحل پر جا کر اس کا استقبال کیا اور یوسف اور اس کے فوجی سرداروں پر تحائف کی بارش کر دی۔ میں نے یوسف کو دعوت دی کہ وہ کچھ دن میرے دارالحکومت اشبیلیہ میں آرام کرے اس کے بعد آگے کی دیکھی جائے گی۔ لیکن یوسف نے ٹکا سا جواب دے دیا کہ میں یہاں آرام کرنے نہیں بلکہ دشمن سے لڑنے آیا ہوں۔ میرا ماتھا اسی وقت ٹھنکا تھا لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

یوسف بن تاشفین اور اس کا المرابطون خاندان صحرائی بربر تھے اور اس کی عمر گھوڑے کی پیٹھ پر گزری تھی۔ اس قبیلے کی عجیب بات یہ تھی کہ عورتوں کی بجائے مرد اپنا چہرہ سیاہ نقاب سے ڈھانپے رکھتے تھے۔ میں نے یوسف کو بھی نقاب کے بغیر بہت کم دیکھا۔ جب اس نے اندلسی امیروں کے ٹھاٹ باٹ دیکھے تو اس کی پیشانی سکڑ گئی۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ اسے یہ کروفر اور عیش اور عشرت بہت ناگوار گزرتے ہیں۔ شاہی تعیش کا کوئی بھی مظہر دیکھ کر وہ زبان سے کچھ نہیں کہتا تھا لیکن منہ ایسے بناتا تھا جیسے دانتوں تلے کنکر آ گیا ہو۔

بربروں اور الفانسو کی افواج مدِ مقابل ہوئیں۔ میں بھی اپنے دلاور دستوں کے ساتھ یوسف کے شانہ بہ شانہ موجود تھا۔ الفانسو نے تمام ہسپانیہ کے عیسائی راجواڑوں کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا اور اس کی فوجوں کے پرے افق کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلے ہوئے تھے۔ جمعرات کا دن تھا۔ الفانسو کی طرف سے ایلچی پیغام لے کر آیا کہ کل جمعہ ہے، جو تمہارا مقدس دن

ہے۔ پرسوں ہفتہ ہے جو یہودیوں کا مقدس دن ہے اور میری فوج کے اکثر منشی اور خزانچی یہودی ہیں۔ اس کے بعد اتوار ہے جو ہمارا مقدس دن ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ ہم پیر کے دن کا انتظار کریں اور اسی دن معرکہ بپا ہو۔ یوسف نے فوراً ہی اس بات سے اتفاق کر لیا۔

جمعے کے دن یوسف اور اس کی فوج اطمینان سے نماز کی تیاری کرنے لگی۔ نہ جانے کیوں میرے دل میں کھٹک سی تھی، میں نے یوسف سے ذکر بھی کیا لیکن اس نے حسبِ معمول میری بات کو گردن کی خفیف سی حرکت سے جھٹک دیا۔ ابھی نمازِ باجماعت کی پہلی رکعت ہی ادا ہوئی تھی کہ الفانسو کے گھڑ سواروں نے ہلہ بول دیا۔

الفانسو کا خیال تھا کہ وہ یوسف کے لشکر کو بے خبری میں آ لے گا۔ لیکن میری آنکھوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ یوسف کے تربیت یافتہ سپاہیوں نے جنوں کی طرح لپک کر ہتھیار اٹھائے اور چھلاووں کی طرح زقندیں لگا کر گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ لمحوں کے اندر اندر وہ یوں تیار ہو گئے جیسے گھنٹوں سے جنگ کی تیاری کر رہے ہوں۔ گھمسان کی لڑائی شروع ہو گئی۔ ہر طرف تلواریں، بھالے اور برچھے بجلیوں کی طرح چمکنے لگے اور تیر سروں پر طوفانی ہواؤں کی طرح سائیں سائیں کرتے گزرنے لگے۔

....

دریائے الکبیر کے دونوں کناروں پر پھیلے ہوئے اس قدیم شہر کا بنیادی رنگ بھورا اور خاکستری ہے۔ شہر کی اکثر تعمیرات اسی رنگ کی نظر آتی ہیں۔ اشبیلیہ خطۂ اندلوسیا کا سب سے بڑا شہر ہے۔ آج سے 12 سو سال پہلے جب سارہ قوطیہ یہاں سے کشتی میں سوار ہو کر اموی خلیفہ ہشام کے دربار میں عرضی لے کر پہنچی تھی، اس وقت بھی، بلکہ اس سے بھی بہت پہلے، اشبیلیہ تمام علاقے میں ممتاز شہر تھا۔

711ء میں شمالی افریقہ کے گورنر موسیٰ بن نصیر نے اپنے جرنیل طارق بن زیاد کو سات ہزار بربر فوجیوں پر مشتمل دستے کے ساتھ سپین پر چڑھائی کے لیے بھیجا۔ اس کے ٹھیک ایک برس بعد وہ خود بھی 18 ہزار فوج لے کر سپین کے ساحل پر آن اترا۔ یہاں اس نے اپنے مقامی راہبروں سے کہا کہ وہ اپنے ماتحت طارق بن زیاد کے نقشِ قدم پر چلنا پسند نہیں کرتا، اس لیے اسے کوئی اور راستا دکھایا جائے۔ چناں چہ گوتھ امرا نے کہا کہ ہم جان بوجھ کر طارق کو نسبتاً غیر آباد علاقے سے لے

گئے تھے، جب کہ آپ کو ہم ایسے راستے سے لے جائیں گے جہاں ایسا شہر آباد ہے جو شان و شوکت میں اپنی مثال آپ ہے۔

تاریخ دان المقری لکھتا ہے کہ اس وقت اشبیلیہ اندلس میں سب سے اہم شہر تھا۔ گوتھوں کے آنے سے قبل یہ اندلس کا دارالحکومت تھا۔ اگرچہ گوتھ بعد میں اپنا پایۂ تخت طلیطلہ (طولیدو) لے گئے، تاہم اشبیلیہ بدستور مذہبی مرکز رہا۔ گوتھ موسیٰ بن نصیر کے آنے کی خبر سن کر قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ بالآخر دو مہینوں کے محاصرے کے بعد کہیں جا کر موسیٰ پر اس شہر کے دروازے کھلے۔ مسلمانوں کو شہر پر قبضہ دلانے میں یہودیوں نے اہم کردار ادا کیا تھا، کیوں کہ وہ عیسائیوں کے مظالم سے نالاں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے دور میں یہودیوں نے بہت ترقی کی اور وہ اہم عہدوں پر فائز ہوتے رہے۔

اس شہر کی ایک اور وجہِ شہرت مشہور رومانوی کردار ڈان ہوان ہے۔ ڈان ہوان خواتین کو گرویدہ بنانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ دنیا کے کئی عظیم تخلیق کاروں نے اس 'مرامزاج لڑکپن سے عاشقانہ ہے' کی زندہ تصویر کے ہوش ربا حالات کو قلم بند کیا ہے۔ انگریزی کے شاعر لارڈ بائرن نے اس پر طویل نظم لکھی، موتسارت نے اسے سمفنی کا موضوع بنایا، جب کہ برنارڈ شا اور پشکن سمیت درجنوں چھوٹے بڑے ادیب و شاعر اس کردار سے متاثر ہوئے۔

اشبیلیہ مسلمانوں کے ہاتھ سے 1248ء میں نکل گیا، لیکن عیسائی حکمرانی میں بھی یہاں مسلمان کئی صدیاں آباد رہے۔ اس شہر کو یہ شرف حاصل ہے کہ یہاں چودھویں صدی کی دیوقامت شخصیت ابنِ خلدون سفیر بن کر تشریف لائے تھے۔ جیسا کہ ابنِ خلدون کے نام سے ظاہر ہے، ان کے آبا کا تعلق الاندلس سے تھا کیوں کہ اندلسی عرب ناموں کے آخر میں 'ون' کا سابقہ آتا ہے۔ اندلس پر عیسائی بادشاہ الفانسو کے قبضے کے بعد ابنِ خلدون کے بزرگ یہاں سے ہجرت کر کے تیونس جا آباد ہو گئے۔ ابنِ خلدون وہیں پیدا ہوئے تھے لیکن آبائی دھرتی کی پکار پر وہ 1362ء میں اندلس آ گئے اور غرناطہ کے دربار سے منسلک ہو گئے۔ وہ غرناطہ کے امیر کی طرف سے سفارتی مشن لے کر 1364ء میں اشبیلیہ کے حکمران پیدرو اول کے پاس آئے تھے اور ان کی کوششوں سے غرناطہ اور اشبیلیہ کے درمیان امن معاہدے پر دستخط ہوئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ پیدرو ابنِ خلدون کے علم و فضل سے اس قدر متاثر ہوا کہ انھیں اپنے دربار سے وابستہ ہونے کی

پیش کش کر ڈالی۔ تاہم ابنِ خلدون نے اسے قبول نہیں کیا۔

جب 1492ء میں کولمبس نے براعظم امریکہ دریافت کیا تو اس کے جہاز اشبیلیہ ہی سے چلے۔ پندرھویں صدی کے آتے آتے سپین اور لاطینی امریکہ کے درمیان تمام تر تجارت اشبیلیہ کے راستے ہونے لگی اور یہ شہر دنیا کے متمول ترین شہروں کی فہرست میں داخل ہو گیا۔ اس نئی دولت کی کشش سے یہاں کئی فن کار بھی کھنچ کر آئے، جن میں ولاسکوئس، زوباران، اور موریلو وغیرہ شامل ہیں۔ حتیٰ کہ ڈان کیخوتے کے مصنف سروانٹس کی شاہکار تخلیق کا بیج اسی شہر کی ایک جیل میں بویا گیا تھا جہاں سروانٹس قرض ادا نہ کرنے کی پاداش میں قید کاٹ رہا تھا۔

تاہم رفتہ رفتہ کچھ دریا میں ریت بھر جانے سے اور کچھ نوآبادیاتی ملکوں کی کثرت کی وجہ سے اشبیلیہ کی رونقوں پر بھی گرد پڑنے لگی، اور آج یہ کہا جاتا ہے کہ گذشتہ تین سو سال سے اس شہر میں کوئی تاریخی واقعہ رونما نہیں ہوا۔ سوائے اس کے کہ یہی وہ شہر ہے جہاں سے سپین کی مشہور فلیمنکو موسیقی کی پھوٹیں، جس کی خوشبو سپین کی سرحدوں سے نکل کر دنیا بھر میں پھیل گئی ہے۔

....

ہماری مشترکہ فوج اور الفانسو کے درمیان گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔ میرے جاں باز سپاہی اور دوسرے اندلسی طائفوں سے آئے ہوئے دستے بے جگری سے لڑے، لیکن الفانسو کی فوجیں تھیں کہ سیلاب کی طرح امڈی چلی آ رہی تھیں۔ ہمارے سپاہی لڑتے لڑتے باداجوز تک پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے، اس دوران یوسف کا لشکر ابتدائی حملے کے بعد زیادہ تر خاموش تماشائی کا کردار ادا کرتا رہا تھا۔ میں خود اپنے جانباز دستوں کے ساتھ پہلی صف میں لڑتا رہا اور میرے ہاتھ میں پانچ تلواریں ٹوٹیں۔

جب یوسف نے دیکھا کہ الفانسو غلبہ پانے کو ہے تو اس نے اپنی فوج کو ایک حکم دیا، جس کے بعد میں نے ایک نرالی چیز دیکھی۔ بربر فوجیوں نے یکایک ایک بے ہنگم قسم کا صحرائی ڈھول بجانا شروع کر دیا جسے سن کر تمام لشکر پلک جھپکتے میں صف بند ہو گیا۔

یوسف کی فوج کا نظم و نسق ایسا تھا جو میں نے پہلے کبھی دیکھا نہ سنا تھا۔ فوج میں بھانت بھانت کے دستے تھے۔ ہر دستے کی تربیت اس طرح کی گئی تھی کہ وہ اپنے اپنے امیر کے اشارے پر اکائی کی طرح حرکت کرتا تھا۔ ہر دستے کا اپنا پرچم اور اپنا ڈھول بردار تھا اور اس کی ہر حرکت

ڈھول کی تھاپ پر ہوتی تھی۔ یہ دستے اس قدر سرعت، اتنی ترتیب اور ایسے ربط و ضبط سے مڑتے، بڑھتے اور جھکائی دیتے تھے کہ گمان ہوتا تھا کہ جیسے یہ سینکڑوں سپاہیوں پر مشتمل نہیں بلکہ ایک جسم ہیں۔ تمام سپاہی ہندوستانی فولاد سے بنی تلواروں اور چمڑے کی ڈھالوں سے لیس تھے۔ اس کے علاوہ یوسف کی فوج میں ترک تیراندازوں کے دستے بھی تھے۔ پہلے ایک قطار تیر چھوڑتی، اور فوراً زمین پر لیٹ جاتی، اس کے بعد دوسری قطار تیروں کی بوچھاڑ کرتی، پھر تیسری۔ اتنی دیر میں پہلی قطار زمین پر لیٹے لیٹے دوبارہ کمانیں تیار کر لیتی۔ اس طرح تیروں کی موسلا دھار برسات جاری رہتی تھی۔

یہ رنگ ڈھنگ سرزمینِ ہسپانیہ کے لیے نرالے تھے، یہاں کے فوجیوں کو اس قسم کی جنگ لڑنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے میدانِ جنگ عیسائی سپاہیوں کی لاشوں سے اٹ گیا۔ الفانسو بڑی مشکل سے بچے کھچے ساتھیوں کے ہمراہ جان بچا کر طلیطلہ بھاگ گیا۔

12 رجب 479 ہجری کو ہونے والے اس معرکے کو جنگِ زلاقہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ زلاقہ عربی میں پھسلواں زمین کو کہتے ہیں۔ نام کی وجہ یہ تھی کہ اس دن اس قدر خون بہا تھا کہ زمین پر قدم جما کر چلنا محال ہو گیا تھا۔ میں خود اس جنگ میں خاصا زخمی ہوا تھا، اور مجھے تین گہرے زخم آئے تھے، تاہم میرے قابل جراحوں کی لیاقت اور رحمتِ خداوندی سے زخم جلد بھر گئے۔

....

اس وقت شام کے سائے گہرے ہو چلے تھے، اس لیے گائیڈ، اتفاق دیکھیے کہ اس کا نام بھی ڈان ہوان تھا، کل صبح ملنے کی نوید دے کر رخصت ہو گیا۔ لیکن مجھے ایک اور مہم کا سامنا تھا۔ ہوا یوں کہ واشنگٹن سے چلتے وقت میں اپنے لیپ ٹاپ کا چارجر ساتھ رکھنا بھول گیا تھا۔ تھوڑا تھوڑا کر کے کچھ دن تو کام چلایا لیکن اب بیٹری بالکل جواب دے چکی تھی۔ میں نے راستے میں ایک الیکٹرانکس کی دکان کا بورڈ دیکھا تھا، چنانچہ ہوٹل کے کمرے میں سامان رکھ کر فوراً باہر نکل آیا۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ہسپانوی زبان کے معاملے میں بہت کٹر ہیں، اور اکثر لوگ انگریزی سے بالکل نابلد ہیں۔ اب ملاحظہ کیجیے کہ کمپیوٹروں کی دکان پر بیٹھے ہوئے نوجوان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ 'لیپ ٹاپ' کس چڑیا کو کہتے ہیں۔ جب حروفِ تہجی ایجاد نہیں ہوئے تھے تو مصر اور

بابل میں تصویری رسم الخط رائج تھا۔ جس چیز کا ذکر کرنا ہوتا تھا، اس کی تصویر بنا دی جاتی تھی۔ چنانچہ میں نے بھی اس قدیم روایت کا احیا کرتے ہوئے کاغذ پر لیپ ٹاپ کا نقشہ کھینچا، پھر اس کی تار اور چارجر بنائے اور آخر میں بیٹری بنا کر اس کے اندر چارج کی قلیل مقدار بھی بجلی کی علامت سے ظاہر کر دی۔

کمپیوٹر دکان والا نوجوان مجھ سے دو ہاتھ آگے نکلا۔ اس نے اس دقیانوسی طرزِ ابلاغ کو نظر انداز کرتے ہوئے جدید ٹیکنالوجی کو ترجیح دی اور اپنے کمپیوٹر پر ہسپانوی زبان میں ایک فقرہ ٹائپ کیا اور پھر ایک مشینی مترجم سافٹ ویر کے ذریعے انگریزی میں منتقل کر کے مانیٹر میرے سامنے گھما دیا۔ لکھا تھا کہ لیپ ٹاپ کا ماڈل کون سا ہے اور کتنے وولٹ کا چارجر درکار ہے؟ میں نے انگریزی میں ٹائپ کیا تو سافٹ ویر نے اسے ہسپانوی میں ترجمہ کر دیا۔ لیکن افسوس کہ ہمارے ان ذولسانی مذاکرات کا نتیجہ مثبت نہ نکل سکا کیوں اس کی اطلاع کے مطابق اس کی دکان تو کجا، پورے اشبیلیہ میں اس قسم کا چارجر ملنے کا امکان نہیں تھا۔

اس مہم سے بے نیلِ مرام واپس ہوا۔ ہوٹل نسبتاً اونچائی پر بنا تھا، جہاں سے شہر کی دور تک پھیلی ہوئی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ مئی کا مہینا تھا اور اگرچہ گرمی اتنی زیادہ نہیں تھی لیکن فضا میں حبس رچا ہوا تھا۔ ابھی خواہش تو تھی کہ ذرا شہر کا ایک چکر لگایا جائے لیکن تمام دن کے سفر کے بعد اپنی بیٹری بھی ڈاؤن ہونے کے قریب تھی، اس لیے ناچار واپس کمرے کا رخ کیا۔

....

معرکۂ زلاقہ میں الفانسو کو شدید زک اٹھانا پڑی تھی، لیکن اس کی کمر پوری طرح سے نہیں ٹوٹی تھی۔ لیکن یوسف نے اس کا پیچھا کرنے کی بجائے فوراً افریقہ واپسی کا طبل بجا دیا۔ وجہ یہ معلوم ہوئی کہ مراکش میں اس کا جوان اور چہیتا بیٹا فوت گیا تھا۔ تاہم اس جنگ کے نتیجے میں کچھ عرصے کے لیے مسلم ریاستوں کی جان الفانسو کی چیرہ دستیوں سے چھوٹ گئی۔

لیکن ابھی تین چار ہی سال گزرے تھے کہ الفانسو نے دوبارہ پر پرزے نکالنے شروع کر دیے۔ مسلم ریاستوں سے خراج کے تقاضے بڑھتے چلے گئے اور جلد ہی وہی صورتِ حال لوٹ آئی جو یوسف بن تاشفین کے حملے سے پہلے تھی۔

حالات یہاں تک پہنچے کہ ایک بار پھر امیرانِ طائفہ جات اور اندلس کے مذہبی رہنما یوسف

بن تاشفین کے پاس جا کر المدد کی صدا بلند کرنے پر مجبور ہو گئے۔ کچھ عرصے تک تو یوسف لیت و لعل سے کام لیتا رہا۔ آخر اس نے فیصلہ کر لیا۔ میرے رقعہ نویسوں نے مجھے اطلاع دی کہ اس بار یوسف واپس جانے کے لیے نہیں بلکہ اندلس کے تمام طائفوں کو مرابطون سلطنت میں ضم کرنے کی نیت سے آ رہا ہے اور اس بارے میں اس نے امام غزالی اور امام الطرطوشی سمیت مسلم دنیا کے بڑے علما سے فتاویٰ بھی حاصل کر رکھے ہیں۔ ان تمام علما نے یہی لکھا تھا کہ اندلس کے حکمران اس قدر عیاش اور گمراہ ہو گئے ہیں کہ انھیں بزورِ شمشیر تخت سے ہٹانا جائز ہے، اور اگر اس سلسلے میں مسلمان خون بھی بہتا ہے تو چنداں مضائقہ نہیں۔

یوسف کا لشکر جنگِ زلاقہ کے چار سال بعد دوبارہ سرزمینِ اندلس پر اترا اور پہلے ہی ہلے میں مالقہ اور غرناطہ کی ریاستوں اپنی سلطنت میں ضم کر لیا اور ان کے امیروں کو گرفتار کر کے مراکش بھجوا دیا۔ اگلے سال قرطبہ کی باری آئی، جس کے بعد اس کی فوجوں نے میری سلطنت اشبیلیہ پر دھاوا بولنے کی تیاری شروع کر دی۔ میں اپنی بربادی کا نظارہ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا تھا، اس لیے بے حد مجبوری کے عالم میں مجھے الفانسو کے سامنے دستِ سوال پھیلانا پڑا۔ اندلس کا سلطان قشتالیہ کے سؤر چرانے پر مجبور ہو گیا تھا۔ الفانسو نے یوسف کے لشکر کو اشبیلیہ کی طرف بڑھتا دیکھ کر غرناطہ پر حملہ کرنے کے لیے پیش قدمی شروع کر دی، لیکن یوسف کے کان پر جوں تک نہ رینگی اور اس نے یلغار کر کے اشبیلیہ پر قبضہ کر لیا۔ میں نے اپنی داستان کے آغاز میں اسی جنگ کا احوال بیان کیا تھا:

کیا ہوا کہ بربروں نے میرا تخت مجھ سے چھین لیا
اور میرے جاں نثار کمان داروں نے مجھ سے منھ موڑ لیا
میری ہمت اور میرا وقار میرے ساتھ ہیں
جنگ کے لیے میں زرہ بکتر کے بغیر گیا
لیکن افسوس، میرا وقت ابھی نہیں آیا تھا

القصہ میں نے اپنے چار نوجوان بیٹوں، الفتح، یزید، مالک اور عبدالجبار کی لاشیں اپنے سامنے گرتی دیکھیں۔ مجھے زنجیروں میں جکڑ کر یوسف بن تاشفین کے سامنے پیش کیا گیا، جس نے بڑی حقارت کا سلوک کرتے ہوئے مجھے اور میرے خانوادے کو جلاوطن کر کے افریقیہ بھجوا

دیا۔ میری وفادار اور سوگوار رعایا نے مجھے رخصت کیا۔ جب ہم سیاہ رنگ کشتیوں میں سوار ہو کر اپنی عزیز از جاں مادرِ وطن کو آخری بار دیکھ رہے تھے تو بربروں کے خوف کے باوجود دریائے وادی الکبیر کے کنارے مجھے الوداع کہنے کے لیے آئی ہوئی میری رعایا کے آنسو بہہ کر دریا کے مٹیالے پانی میں گھل رہے تھے۔

....

اگلے دن سب سے پہلی منزل ہیرالدا تھی۔ یہ اشبیلیہ میں مسلمانوں کی سب سے اہم مسجد کا مینار ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ اس شہر میں موجود سینکڑوں مساجد کی یہ واحد نشانی بطور تبرک بچی ہے۔ یہ مینار ایک بہت بڑی مسجد کا حصہ تھا جسے افریقہ سے آنے والے الموحد حکمران ابو یعقوب یوسف نے تعمیر کروایا تھا۔

اگر آپ اشبیلیہ کی سڑکوں پر کھو جائیں تو ہیرالدا کا مینار لائٹ ہاؤس کی طرح رہنمائی کرتا ہے۔ اس کی بلندی سو میٹر ہے، اور اپنے دور میں یہ دنیا کا بلند ترین مینار تھا۔ اسی دور میں اسی قسم کے دو اور مینار بھی تعمیر کیے گئے تھے، ایک مراکش میں اور دوسرا رباط میں۔ ان میناروں کو 'تین بہنیں' کہا جاتا ہے۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ الموحد طالبان قسم کے حکمران تھے اور انھیں آرٹ سے کوئی علاقہ نہیں تھا۔ لیکن سلسلے وار محرابوں اور اینٹوں سے بنائے گئے نقوش و نگار سے مزین ہیرالدا کا پروقار حسن کچھ اور ہی کہانی سناتا ہے۔

مینار کی چوٹی تک جانے کے لیے سیڑھیوں کی بجائے ڈھلوان بنائی گئی ہے، اس لیے اس پر چڑھنا بہت آسان ہے۔ روایت ہے کہ سن رسیدہ مؤذن گدھے پر سوار ہو کر اذان دینے کے لیے اوپر جایا کرتے تھے۔ الفانسو ششم اشبیلیہ فتح کرنے کے بعد اذان دینے نہیں بلکہ اپنی فتح کا برسرِ مینار اعلان کرنے کے لیے گھوڑا چڑھا کر مینار کی چوٹی تک پہنچا تھا۔

....

جب ہم مراکش کے شہر طنجہ میں اترے تو میرے آنے کی خبر دور دور تک پھیل چکی تھی۔ شہر بھر کے شعرا اور ادبا مجھ سے ملنے کے لیے فصیلِ شہر تک آئے ہوئے تھے۔ شاعر الحسری نے آگے بڑھ کر مجھے عربی شاعری کا ایک انتخاب پیش کیا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ بھاری انعام اور خلعت پاتا،

لیکن وہ اس بے چارگی کے عالم میں مجھ سے ملا تھا۔ میں نے اپنے لباس کی جیبیں ٹٹول کر اپنے ہی خون سے رنگی ہوئی آخری اشرفی نکالی اور اس کے حوالے کر دی۔

جب میں نے لوگوں کا ایک ہجوم دیکھا
جو بارش کے لیے دعا مانگنے اکٹھا ہوا تھا
میں نے کہا، میرے آنسو ہی جل تھل کرنے کے کافی ہیں
سچ ہے
انھوں نے جواب دیا
لیکن تمھارے آنسو خون سے رنگے ہوئے ہیں

کیسی بلندی، کیسی پستی۔ میں نے نیک نامی، آرام و آسائش اور عزت و شہرت کی معراج دیکھی تھی، اب میں زنجیروں میں جکڑا ہوا برہنہ سر، پا پیادہ، بر بر سپاہیوں کے دھکے کھاتا اور گالیاں سنتا کوہِ اطلس کے دامن میں واقع اغمات کے قلعے کی طرف چلا جا رہا تھا۔

....

جب 1248ء میں فرڈیننڈ ثالث نے اشبیلیہ فتح کر لیا تو حسب دستور مسجد کو گرجا بنا دیا گیا اور اس کے مینار پر گھنٹیاں نصب کر دی گئیں۔ 1365ء میں مسجد زلزلے میں تباہ ہوگئی تو اس کی جگہ پر عیسائیوں نے ایک عظیم الشان کلیسا کا ڈول ڈالا جس میں بڑی حد تک مسجد کے نقشے سے استفادہ کیا گیا تھا۔ اس عظیم الشان عمارت کی تعمیر ایک صدی سے زیادہ عرصے تک جاری رہی۔ معماروں کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ وہ کہتے تھے ہم ایسی عمارت بنائیں گے جسے دیکھ کر دنیا کہہ اٹھے گی کہ اس کے بنانے والے پاگل تھے۔ اٹلی میں ویٹیکن اور لندن میں سینٹ پیٹرز کے بعد یہ دنیا میں تیسرا سب سے بڑا کلیسا ہے۔

اب ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ اس کلیسا کے معمار پاگل تھے یا نہیں، لیکن واقعی یہ عمارت جاہ و جلال سے لب ریز نظر آتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے میناروں، چھجوں اور محرابوں کے جنگل کے بیچوں بیچ گہرے بھورے رنگ کا مساجد کی طرز کا گنبد مسلم اثر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

ہیرالدا کے بالکل سامنے اَلکاسار ہے، جو عربی لفظ 'القصر' یعنی محل کی ہسپانوی شکل ہے۔ سرکاری طور پر یہ اب بھی شاہی محل ہے اور اگر سپین کا شاہی خاندان کبھی اشبیلیہ آئے تو یہیں قیام کرتا ہے۔

محل کے اندر داخل ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے الحمرا پہنچ گئے ہیں۔ میں نے اس وقت تک غرناطہ کا مشہور محل الحمرا نہیں دیکھا تھا، البتہ اس کی تصاویر ضرور ذہن میں محفوظ تھیں۔ محل کا بڑا حصہ پیدرو ظالم (Pedro the Cruel) کے دور میں تعمیر ہوا تھا۔ اس دور میں جب کہ انسانی حقوق کی پاسداری کا کوئی تصور نہیں تھا اور تمام حکمرانوں کے ہاتھ خون میں رنگے ہوتے تھے، پیدرو کا اپنے لیے ظالم کا خطاب حاصل کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس نے کوئی خصوصی کمال دکھایا ہوگا۔ ایک مثال تو سامنے کی ہے کہ اس نے اسی محل میں اپنے بھائی کو اپنے ہاتھوں سے قتل کیا تھا۔

پیدرو ظالم نے خاص طور پر مسلم غرناطہ سے مرصع کار منگوائے تھے۔ چنانچہ القصر کی دیواریں الحمرا ہی کا نقشہ پیش کرتی ہیں۔ حتیٰ کہ جگہ جگہ مربع کوفی تحریر میں عربی عبارات بھی لکھی نظر آتی ہیں، جن میں پیدرو کو سلطان لکھا گیا ہے۔ وہ عمارات جو مسلمان معماروں نے عیسائی حکمرانی میں بنائی تھیں، ان کے طرزِ تعمیر کو مودیجر (Mudejar) کہا جاتا ہے، جو عربی لفظ 'المتاخر' یعنی 'پیچھے رہ جانے والے' کی بگڑی ہوئی شکل ہے، اور یہ ایسے مسلمانوں کو کہا جاتا تھا جو عیسائی ریاستوں میں رہ گئے تھے۔

کئی گھنٹے الکاسار میں گزارنے کے بعد گائیڈ ہمیں آس پاس کی گلیوں میں لے گیا، جن کا بیشتر حصہ خاصا پرانا ہے، اور وہاں گھروں کے اندر مسلم دور کی طرز کے باغ بنے ہوئے ہیں۔ ایک تنگ گلی سے گزرتے ہوئے میں ایک کیفے کا نام دیکھ کر ٹھٹک گیا، 'اعتماد بار اینڈ کیفے ٹیریا'۔

....

مجھے ملکہ اعتماد اور میری بیٹیوں سمیت کوہِ اطلس کے قلعۂ اغمات میں قید کر دیا گیا۔ میرے اوپر تو جو گزری سو گزری، میرے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ بات میری نازونعم سے پلی ہوئی شہزادیوں کو پیٹ پالنے کے لیے اون بنتے ہوئے دیکھنا تھا۔ قید خانے میں پہلی عید کے موقعے پر میں نے یہ نظم کہی تھی:

گزرے دنوں میں تہوار تمہارے لیے خوشی کی نوید لاتے تھے
لیکن اس پرمسرت دن نے تمہیں اغمات میں پابہ جولاں پایا ہے
تم اپنی پھول سی بیٹیوں کو چیتھڑوں میں ملبوس
اور بھوک سے سوکھ سوکھ کر کانٹا بنتے دیکھ رہے ہو

جو غربت کے ہاتھوں روئی دھنکنے پر مجبور ہیں
وہ نظریں نیچی کر کے تم سے عید ملنے آئی ہیں
وہ پاؤں جو کبھی اطلس و کمخواب کو ٹھکراتے تھے
اب اغمات کی گلیوں کی کیچڑ میں چلتے ہیں
ان کے پچکے ہوئے گالوں پر آنسوؤں نے راستے بنا دیے ہیں
خداوندا، ایسی عید دوبارہ نہ لانا
اپنی عظمت کے نشے میں چور بادشاہ
احمقوں کی جنت کے مقیم ہوتے ہیں

1093ء میں معتمد اور اعتماد کے آخری بچ جانے والے بیٹے نے یوسف بن تاشفین کے خلاف بغاوت کر دی، کچھ دنوں کے لیے معتمد کے دل میں امید کی کرن نے بسیرا کیا، لیکن پھر قلعے کی سنگلاخ برجیوں کے پار سے خبر پہنچی کہ ابنِ جبار بھی بربر فوج کی آندھی کے سامنے خس و خاشاک سے زیادہ مزاحمت نہ کر سکا اور اسے بھی تہِ تیغ کر دیا گیا۔ اعتماد اپنے بیٹے کی موت کا صدمہ برداشت نہ کر سکی اور چند مہینوں کے اندر اندر گھل گھل کر مر گئی۔ اپنی محبوب ملکہ کے مرنے کے کچھ ہی عرصے بعد المعتمد نے بھی دنیا کو خیر باد کہہ دیا۔

المعتمد کے دربار کی شان و شوکت اور اس کی ذاتی دریا دلی اور شجاعت کی وجہ سے اسے اندلس کی تاریخ میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ یہی نہیں بلکہ المعتمد کا شمار عربی کے اہم شعرا میں بھی ہوتا ہے۔ تاریخ دان ابن خلکان معتمد کے بارے میں لکھتا ہے کہ وہ سپین کے تمام حکمرانوں سے زیادہ کشادہ دل، ہمدرد، سخی اور طاقت ور تھا۔ اس کا دربار مسافروں کی پناہ گاہ اور شاعروں کی مشاعرہ گاہ اور باصلاحیت لوگوں کی امیدوں کا مرکز تھا۔

علامہ اقبال نے معتمد کی ایک نظم کا اردو ترجمہ کیا ہے جو 'بالِ جبریل' میں شامل ہے:

قید خانے میں معتمد کی فریاد

معتمد اشبیلیہ کا بادشاہ اور عربی شاعر تھا۔ ہسپانیہ کے ایک حکمران* نے اس کو شکست دے کر قید میں ڈال دیا تھا۔ معتمد کی نظمیں انگریزی میں ترجمہ ہو کر وزڈم آف دی ایسٹ سیریز میں شائع

*یہاں علامہ کو تھوڑی سی غلط فہمی ہوگئی ہے، معتمد کو کسی اندلسی بادشاہ نے نہیں بلکہ بربر بادشاہ ابن تاشفین نے قید کیا تھا۔

ہو چکی ہیں۔

اک فغاں بے شرر سینے میں باقی رہ گئی
سوز بھی رخصت ہوا، جاتی رہی تاثیر بھی
مردِ حر زنداں میں ہے بے نیزہ و شمشیر آج
میں پشیماں ہوں، پشیماں ہے مری تدبیر بھی
خود بخود زنجیر کی جانب کھنچا جاتا ہے دل
تھی اسی فولاد سے شاید مری شمشیر بھی
جو مری تیغ دودم تھی، اب مری زنجیر ہے
شوخ و بے پروا ہے کتنا خالقِ تقدیر بھی!

یوسف بن تاشفین نے تمام مسلم اندلس کو اپنی مرابطون سلطنت کے جھنڈے تلے اکٹھا کر لیا، جس سے عیسائیوں کے استرداد (Reconquista) کے آگے بند باندھ دیا۔ اس کے بارے تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ یوسف بن تاشفین اندلس میں اسلام کا نجات دہندہ بن کر آیا تھا۔ اس کی عمر اس وقت 70 سال تھی۔ وہ لمبا تڑنگا اور مثالی صحت کا مالک تھا۔ اس کی بھویں آپس میں ملتی تھیں، اور اس کی آواز بلند آہنگ تھی۔ وہ صحرائے اعظم صحارا میں لمتونہ نامی بربر قبیلے میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے قبیلے نے اس وقت اسلام قبول کیا جب یوسف ہوش سنبھال چکا تھا۔ یوسف کی خوراک جَو کی روٹی، دودھ اور اونٹ کا گوشت تھا، اور وہ صرف اونی کپڑے پہنتا تھا۔ صحرائی قبیلوں کے رواج کے مطابق اس کا چہرہ ہمیشہ نقاب سے ڈھکا رہتا تھا۔

ابن تاشفین نے لمبی عمر پائی، تاہم 1106ء میں اس کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے سلطنت کو یوسف کی سی قابلیت سے نہیں چلا سکے۔ دوسری طرف المرابطون خاندان کی حکومت کو اندلس میں کبھی بھی پسند نہیں کیا گیا، کیوں کہ یہ صحرائی بربر تھے اور اندلس کے صدیوں پرانے پرشکوہ تمدن کے مخمل میں ان کا وجود ٹاٹ کے پیوند کی طرح تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ 1147ء میں شمالی افریقہ کے بڑے حصے اور اندلس پر پھیلی ہوئی المرابطون حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

المرابطون کا خاتمہ مراکش ہی کے ایک اور بربر قبیلے کے ہاتھوں ہوا جسے تاریخ الموحدون کے نام سے جانتی ہے۔ الموحدون طالبان کی طرح انتہائی سخت گیر اور انتہا پسند تھے۔ یوسف بن

تاشفین کے جانشینوں کی کمزوریوں کا فائدہ اٹھا کر وہ دیکھتے ہی دیکھتے پہلے مراکش اور بالآخر اندلس پر بھی اپنا جھنڈا لہرانے میں کامیاب ہو گئے۔ 1170ء میں الموحدون نے اپنا دارالحکومت بھی اشبیلیہ منتقل کر دیا۔ اشبیلیہ کی عظیم مسجد انھی کی بنائی ہوئی ہے۔ آج جس کی یادگار ہیرالدا کے مینار کی صورت میں باقی ہے۔

تاہم الموحدون زیادہ عرصے تک شمالی ہسپانیہ کی عیسائی ریاستوں کو دور رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ ایک ایک کر کے شہر مٹھی سے ریت کی طرح پھسلتے چلے گئے۔ 1236ء میں قرطبہ اور 1248ء میں اشبیلیہ پر عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا۔ اس وقت سے لے کر 1492ء تک صرف غرناطہ کی ریاست ایسی تھی جہاں مسلمانوں کی حکومت برقرار تھی۔

غرناطہ، الحمرا محل کا شہر، جو میری اگلی منزل تھا۔

آہ الحمرا!

چین، ہندوستان، ملایا، قسطنطنیہ اور تقریباً تمام اسلامی دنیا کا سفر مکمل کرنے کے بعد میں اپنے شہر طنجہ واپس پہنچا تو مجھے گھر سے نکلے ہوئے 24 سال ہو چکے تھے۔ واپسی کے سفر کے دوران مجھے دمشق ہی میں معلوم ہو چکا تھا کہ میرے والد کا پندرہ برس قبل انتقال ہو چکا ہے۔ طنجہ پہنچ کر معلوم ہوا کہ والدہ بھی چند ہی ماہ پہلے فوت ہوگئی ہیں۔ پردیس میں مجھے ہر گھڑی اپنی والدہ کا خیال آتا تھا لیکن جب بھی وطن واپسی کا ارادہ کرتا، کوئی نہ کوئی نئی مہم آڑے آجاتی اور میری واپسی ملتوی ہوتی چلی جاتی۔

طنجہ لوٹ کر میں نے پہلا کام یہ کیا کہ سیدھا مراکش کے عالی مرتبت سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا اور انھیں اپنے سفر وحضر کے واقعات سنائے جو میر نے نہایت توجہ اور دلچسپی سے سماعت کیے۔ یہ اوپر والے کا کرم ہے کہ اس نے ہمارے سروں پر سلطانِ عالی مقام کو سایہ فگن کر رکھا ہے۔

اس کے بعد میں اپنی والدہ کی قبر پر گیا، جس کی ابھی مٹی کچی ہی تھی۔ میں نے جب چوتھائی صدی قبل طنجہ سے رختِ سفر باندھا تھا تو اس وقت میں 21 برس کا نوخیز تھا اور میری والدہ نے مجھے بھیگی پلکوں کے ساتھ رخصت کیا تھا۔ میں نے جاتے جاتے یہ کہہ کر ان کے آنسو پونچھے تھے کہ حج کی سعادت حاصل کر کے بس یوں گیا اور یوں واپس آیا۔

مراکش کا ایک ساحلی قصبہ سبت ہے۔ وہاں میرے کچھ عزیز اور دوست تھے۔ میں کچھ دنوں بعد وہاں چلا گیا۔ معلوم نہیں اس قصبے کی ہوا میں خرابی تھی کہ کچھ اور، میں وہاں جاتے ہی بیمار پڑ گیا۔ رفتہ رفتہ حالت کچھ ایسی بگڑی کہ میں تین ماہ تک صاحبِ فراش رہا۔ اس دوران میں سوچتا تھا کہ وہ ابنِ بطوطہ جو ہیبت ناک سمندری طوفانوں، سفاک سلطانوں، لق و دق صحراؤں اور خوں خوار قزاقوں سے بچ نکل کر، دنیا بھر کی خاک چھان کر صحیح سلامت گھر پہنچ گیا، اب ایک معمولی سی

بیماری کا لقمہ بننے والا ہے۔ میں بستر پر پڑا پڑا سوچا کرتا تھا اور حیران ہوتا تھا کہ مجھ میں اور میرے بڑے بھائی میں کیا فرق ہے، جو زندگی بھر طنجہ سے بیس کوس سے زیادہ دور نہیں گئے، سوائے اس کے کہ میرے ذہن میں چند دھندلی دھندلی یادیں جھلملاتی ہیں، اور پاؤں میں گٹے پڑے ہوئے ہیں، اور بس۔ کبھی کبھی تو مجھے شبہ گزرتا تھا کہ شاید میں نے بھی زندگی بھر طنجہ سے باہر قدم ہی نہیں نکالا اور جو کچھ میں نے دیکھا وہ میرے بخار میں تپتے ذہن کا ہذیان ہے۔

اس سے پہلے کہ میں صبر کا دامن چھوڑ دیتا، قادرِ مطلق نے کمال کرم نوازی سے مجھے شفا بخشی۔ سبت آبنائے جبل طارق پر آباد ساحلی قصبہ ہے، اس کے بالکل سامنے سرزمینِ اندلس ہے جو ساحل سے نظر آتی ہے۔ میں نے اپنے طویل اسفار کے دوران اندلس کے بڑے قصے سنے تھے اور مجھے بڑا اشتیاق تھا کہ اس سرزمین کی سیر بھی کی جائے۔ اسی دوران قدرت نے ایک سنہرا موقع فراہم کر دیا۔

ہوا یوں کہ سبت میں میرے قیام کے دوران ہی خبریں پھیلنا شروع ہو گئیں کہ قشتالیہ کا بادشاہ الفانسو یازدہم جبل الطارق پر فوج کشی کی تیاریاں کر رہا ہے۔ جبل الطارق اگر الفانسو کے قبضے میں چلا جاتا تو اس سے مراکش کی سلامتی کو سنگین خطرات لاحق ہو جاتے۔ اس وقت غرناطہ کو چھوڑ کر جبل الطارق وہ واحد علاقہ تھا جو مسلمانوں کے قبضے میں تھا ورنہ تمام اندلس پر عیسائی قابض ہو چکے تھے۔

میں اصیلہ قصبے کے لوگوں کے ساتھ ایک بجرے میں بیٹھ کر الفانسو سے لڑنے کے لیے اندلس کی سمت روانہ ہو گیا۔ سرزمینِ اندلس، جس پر خدا کی نعمتوں کی فراوانی ہے، اور جہاں مسافر اور مقیم دونوں کو برابر کا حصہ ملتا ہے۔

....

اشبیلیہ سے غرناطہ

اشبیلیہ میں تین دن گزارنے کے بعد ہمارا چھوٹا سا قافلہ غرناطہ کی سمت چل پڑا۔ امریکی مصنف واشنگٹن ارونگ کو مسلم اندلس سے بڑی محبت تھی۔ اس نے کئی کہانیاں اور کتابیں لکھ کر یورپ کے اس فراموش کردہ باب کو مغربی دنیا میں متعارف کروایا۔ ارونگ نے 1829ء میں اشبیلیہ سے غرناطہ کا سفر کیا تھا، جس کی روداد اس نے اپنی کتاب 'الحمرا' میں شامل کی ہے۔ یہ کل ڈھائی سو کلومیٹر

کا سفر ہے، جسے طے کرنے میں ارونگ نے دو ہفتے سے زیادہ کا وقت لگایا تھا، لیکن ہم چند گھنٹوں میں وہاں پہنچنے والے تھے۔ میں اشبیلیہ سے غرناطہ جانے والی دو لین والی جدید ترین موٹر وے A-92 پر رواں دواں تھا، لیکن ارونگ کے زمانے میں حالات تھوڑے مختلف تھے۔ وہ لکھتا ہے:

> راستا بلند و بالا پہاڑوں سے گزر کر جاتا ہے، ٹوٹی پھوٹی سڑکوں پر ڈاکوؤں کا سکہ چلتا ہے۔ میں نے اور میرے ساتھی نے اپنا سامان پہلے ہی بھجوا دیا تھا اور اپنے ساتھ زادِ راہ اور کپڑے رکھے تھے۔ میں نے احتیاطاً سفری ضرورت سے کچھ زیادہ رقم جیب میں رکھی تھی۔ کبھی ڈاکو صاحبان سے پالا پڑ جائے اور آپ کی جیب خالی ہو تو ڈاکو اپنی محنت اکارت جانے پر طیش میں آ کر آپ کا حلیہ بگاڑ سکتے ہیں، کیوں کہ وہ یہ سمجھیں گے کہ آپ نے انھیں دھوکا دیا ہے۔

ہمارا قلی اور گائیڈ ایک بیس سالہ ہسپانوی لڑکا تھا۔ جس کے کندھوں پر ہماری حفاظت کی بھاری ذمے داری بھی عائد تھی۔ اس مقصد سے عہدہ براہونے کی خاطر اس کے پاس ایک بھاری بھرکم کاربین تھی۔ تاہم اس نے ہمیں سفر کی ابتدا ہی میں آگاہ کر دیا کہ اکا دکا مہم جو ڈاکو سے تو وہ بخوبی نمٹ لے گا، لیکن اگر خدانخواستہ ڈاکوؤں کے مشہور جتھے 'فرزندانِ عیسیٰ' سے واسطہ پڑ گیا تو ہم اپنے ذمے دار آپ ہوں گے۔ تاہم سفر کے دوران یہ چوبی کاربین اس کے گھوڑے کی کاٹھی کے ساتھ لٹکتی رہی اور اس نے کبھی اس میں کارتوس بھرنے کی زحمت بھی نہیں کی۔ ہم نے ڈان کیخوتے کے ملازم کی مناسبت سے اس کا نام سانچو رکھ لیا۔

....

میں نے کوشش کی تھی کہ واشنگٹن ارونگ نے اشبیلیہ سے غرناطہ کے سفر کے دوران جن مقامات کا ذکر کیا ہے، ان کا جائزہ لے سکوں۔ اس کی بیان کردہ گندول نامی بستی مجھے کہیں نظر نہیں آئی، جہاں ارونگ کو مسلمانوں کے بنائے ہوئے ایک قلعے کے آثار نظر آئے تھے، البتہ اشبیلیہ سے 20 کلومیٹر دور Gandul-Marchenilla کے نام کا ایک سائن بورڈ ضرور دیکھنے کو ملا۔ گندول شاید اس سامنے والی پہاڑی کے پیچھے کہیں ہو۔

اس سے اگلا سٹاپ الرحل نامی قصبے کا تھا۔ اور پندرہ بیس منٹ بعد مجھے سڑک کی دائیں

طرف ایک سفید رنگ کا بورڈ دکھائی دے گیا جس پر سیاہ حروف میں Cornil El Rahal لکھا ہوا تھا۔ وسیع و عریض میدان میں قائم ایک چھوٹا سا صاف ستھرا سا قصبہ، جس کی مرکزی رویہ سڑک 'کریرا ولا مارتن' کے ایک طرف پام کے درخت لگے ہوئے تھے اور دوسری طرف کاروں کے شو روم تھے۔ یہاں واشنگٹن ارونگ کو سرخ فیتے کا سامنا کرنا پڑ گیا تھا۔ تاہم یہ ثابت ہوا کہ اس دور کی ہسپانوی پولیس آج کی پنجاب پولیس سے زیادہ مختلف نہیں تھی:

> سورج طلوع ہونے سے تھوڑی ہی دیر قبل ہم الرحل نامی قصبے میں پہنچ گئے۔ یہ پہاڑیوں سے گھری ہوئی ایک چھوٹی سی آبادی ہے۔ ہم نے قصبے میں پہنچتے ہی دیکھا کہ یہاں خوب چہل پہل کا سماں ہے۔ معلوم ہوا کہ پولیس کا دستہ یہاں آیا ہوا ہے جس نے علاقے کو ڈاکوؤں سے پاک کرنے کا عزم کر رکھا ہے۔ ہم غیر ملکیوں کو دیکھتے ہی ان میں بے چینی اور تجسس کی لہر دوڑ گئی۔ انھوں نے ہمارے سفری کاغذات دیکھنے کا مطالبہ کیا۔ میرا پاسپورٹ انگریزی زبان میں تھا، اس لیے چراغ کی ٹمٹماتی ہوئی لو میں انھیں اسے سمجھنے میں بڑی دشواری پیش آئی۔ تاہم اس موقعے پر سانچو نے خاصی سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کرتے ہوئے میری سرکاری اہمیت کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ اسی دوران سگار تقسیم کرنے کا نسخہ بھی کام آیا اور تھوڑی ہی دیر میں دھوئیں کے مرغولوں میں سپاہیوں کے دوستانہ قہقہے بھی شامل ہو گئے۔

....

اوسونا

آگے چل کر ایک اور سائن بورڈ نے خبر دی کہ اوسونا کا قصبہ سڑک کے بائیں طرف جب کہ ایتجی کویرا دائیں طرف واقع ہے۔ واشنگٹن ارونگ نے یہاں بھی ایک رات گزاری تھی تاہم خلافِ معمول یہاں اس کے ساتھ کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ اوسونا سے پہلے پہاڑیوں پر زیتون کے درختوں کے قطار اندر قطار جھنڈ ہیں۔ بعد میں یہی نظارہ ہر طرف نظر آنے لگا۔ افق سے افق تک، میدانوں میں، پست قد پہاڑیوں پر زیتون کے درختوں کی صفیں کسی تربیت یافتہ فوج کی

طرح ترتیب سے کھڑی نظر آتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ سپین دنیا میں زیتون کا تیل پیدا کرنے والا سب سے بڑا ملک ہے۔

زیتون مقدس درخت ہے، اس کا ذکرِ خیر تورات، انجیل اور قرآن میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ انجیل کے مطابق طوفانِ نوح کے دوران ایک فاختہ اپنے چونچ میں زیتون کی شاخ پکڑ کر لائی تھی جس سے نوح علیہ السلام کو اندازہ ہوا تھا کہ سیلاب تھمنے کو ہے۔

عربوں کے لیے زیتون کے تیل کی کیا اہمیت تھی، اس کا اندازہ سورۂ نور کی ان آیات کے ترجمے سے لگائیے:

> اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس کے نور کی مثال اس طاق کی ہے جس میں چراغ جل رہا ہو اور چراغ شیشے کی قندیل میں ہو اور قندیل ایک جگمگاتے ستارے کے مانند ہو جسے زیتون کے بابرکت درخت سے روشن کیا جائے۔ وہ درخت جو نہ مشرق کی سمت والا ہو نہ مغرب کی سمت والا۔ اور قریب ہو کہ اس کا روغن بھڑک اٹھے چاہے اسے آگ مس بھی نہ کرے۔ یہ نور بالائے نور ہے۔

ویسے تو سپین میں زیتون کی کاشت زمانہ قبلِ مسیح سے جاری تھی لیکن یہ مسلمان تھے جو اپنے ساتھ نئی اقسام لے کر آئے اور یہاں زیتون کی کاشت کو باقاعدہ صنعت کی حیثیت دے دی۔ یہی وجہ ہے کہ ہسپانوی زبان میں زیتون کے تیل کو ایسیتونا کہا جاتا ہے جو الزیتونہ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

....

جبل الطارق

جبل الطارق کی عظیم الجثہ چٹان اپنی مثال آپ ہے۔ یہاں پہنچ کر آپ کو اولین مسلم جرنیل طارق بن زیاد کے گھوڑے کی ہنہناہٹ تک سنائی دیتی ہے۔ جبل الطارق میں دو دن گزار کر ہم نے رونڈا کی راہ لی، جو اس تمام علاقے کا سب سے خوب صورت اور دل کش قصبہ ہے۔ یہاں کا قلعہ بے حد دیدہ زیب اور ناقابلِ تسخیر ہے۔ یہاں کا قاضی حکیم ابوالقاسم محمد بن یحییٰ ابن البطوطہ میرا چچازاد بھائی تھا۔ ہم بچپن کے ساتھی تھے، لیکن میرے اسفار کے دوران طویل غیر حاضری کے

بعد میرے باقی رشتے داروں کی طرح اس نے بھی مجھ پر فاتحہ پڑھ لی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سماتا تھا اور کرید کرید کر میری مہمات کی تفاصیل پوچھتا تھا۔ اس نے میری اور میرے ساتھیوں کی بڑی آؤ بھگت کی اور ہمارے جذبے کو دل کھول کر سراہا۔ تاہم اسی دوران معلوم ہوا کہ الفانسو اور اس کے لشکر کا بڑا حصہ طاعون کا شکار ہو گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی جبل الطارق کو فتح کرنے والی مہم بھی اپنی موت آپ مر گئی ہے۔ میرے بہت سے ساتھی یہ سن کر واپسی کی تیاری کرنے لگے، لیکن میں نے سوچا کہ اب اندلس آ ہی گیا ہوں تو کیوں نہ یہاں کے عظیم شہروں، خاص طور پر مالقہ اور غرناطہ کو بھی ایک نظر دیکھ لیا جائے۔ مجھے خاص طور پر غرناطہ کے محلات دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ میرے اسفار کے دوران اکثر ان محلات کے جادوئی حسن کا تذکرہ سننے میں آیا کرتا تھا۔

میں رونڈا میں پانچ روز رہا، جس کے بعد میری اگلی منزل ماربلہ تھا۔ رونڈا اور ماربلہ کے درمیان کا راستا بے حد مشکل ہے۔ مسافر جگہ جگہ گھٹنوں تک کیچڑ میں دھنس جاتے ہیں۔ پھر زمین کٹی پھٹی ہونے کی وجہ سے قدم قدم پر چڑھائی یا پھر اترائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ خیر، خدا خدا کر کے ہم ماربلہ پہنچے۔ زرخیز زمینوں کے دامن میں بسا ہوا صاف ستھرا قصبہ ہے۔ یہاں سے مجھے مشہور اندلسی شہر مالقہ جانا تھا۔

ماربلہ کی سرائے میں مجھے معلوم ہوا کہ بارہ گھڑ سوار مالقہ جانے کے لیے رختِ سفر باندھ رہے ہیں۔ اجنبی راستوں پر اچھے ہم سفر مل جائیں تو راستے کی صعوبتیں آدھی ہو جاتی ہیں۔ میں نے گھڑ سواروں سے بات کی تو وہ بخوشی مجھے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ طے پایا کہ ہم صبح پو پھٹتے ہی سفر پر نکل کھڑے ہوں گے۔

اب اسے اتفاق کہیے یا اوپر والے کا کرشمہ کہ اگلی صبح مجھے اٹھتے اور تیار ہوتے دیر ہو گئی۔ گھڑ سواروں میں سے ایک میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ ہم تو نکل رہے ہیں، آپ بعد میں آرام سے آیئے، ہم اگلی منزل پر آپ کا انتظار کریں گے۔

میں نے کوئی ایک پہر بعد سفر اختیار کیا۔ کچھ ہی دیر بعد میں ماربلہ کی حدود سے نکل کر سہیل کے ضلعے کی عمل داری میں داخل ہو گیا۔ موسم خوش گوار تھا، اور ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا میرے چہرے پر چینی ریشم کے رومال کی طرح ٹکراتی تھی۔ میں نے اپنے گھوڑے کو اس کی مرضی پر چھوڑ دیا۔

راستے کے ایک طرف چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں اور دوسری طرف حدِ نظر تک نیلا سمندر پھیلا ہوا تھا۔

ابھی کچھ ہی دور گیا تھا کہ مجھے راستے کے ایک طرف کھائی میں ایک مردہ گھوڑا پڑا نظر آیا۔ کچھ ہی دور سڑک کے بیچوں بیچ مچھلیوں کی ٹوکری اوندھی پڑی تھی۔ میرا ماتھا ٹھنکا، یاالٰہی یہ کیا بھید ہے۔ ادھرادھر دیکھا تو دور ایک پہاڑی پر فوجی چوکی نظر آئی، جس پر ایک مینار بھی بنا ہوا تھا۔ اس مینار میں ہر وقت ایک محافظ موجود ہوتا تھا اور خطرے کی صورت میں گھنٹیاں بجا کر لوگوں کو خبردار کر دیتا تھا، لیکن اس وقت یہ مینار بھی خالی تھا۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔

میں چوکی کے قریب پہنچا تو پیچھے سے آواز آئی، 'مسافر، رک جاؤ!'

میں نے مڑ کر دیکھا تو سہیل کا عمل دار کچھ سپاہیوں کے ساتھ چلا آ رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ قزاقوں کی چار کشتیاں اچانک ساحل پر نمودار ہوئیں۔ اس وقت محافظ مینار میں موجود نہیں تھا۔ انھوں نے اتر کر ایک قافلے پر دھاوا بول دیا۔

معلوم ہوا کہ میرے ساتھی بارہ گھڑسوار ان کی زد میں آ گئے۔ قزاقوں نے ان میں سے ایک کو قتل کر ڈالا، ایک گھڑسوار بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا، جب کہ انھوں نے دس کو پکڑ لیا ہے اور ان کے بدلے میں تاوان مانگ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ قزاقوں نے ایک مچھیرے کو بھی ہلاک کر ڈالا ہے اور میں نے سڑک پر مچھلیوں کی جو ٹوکری پڑی دیکھی تھی وہ اسی کی تھی۔

عمل دار نے مجھے تلقین کی کہ میں رات اس کی چوکی میں گزاروں اور صبح وہ ایک دستے کے ساتھ مجھے مالقہ پہنچا دے گا۔ میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے اس حملے کا شکار ہونے سے بال بال بچایا۔ رات میں نے سونے سے قبل کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو دور سمندر میں قزاقوں کی کشتیوں کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔

....

جب سولھویں اور سترھویں صدیوں میں ہسپانوی مسلمانوں کو زبردستی عیسائی بنایا گیا تو ان کو زیتون کے تیل کی بجائے سؤر کی چربی میں کھانا پکانے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ البتہ دور دراز کے دیہی علاقوں کے مسلمان جو ظاہری طور پر عیسائی ہو گئے تھے، بدستور زیتون کا تیل استعمال کرتے رہے۔ رفتہ رفتہ زیتون کے تیل کے استعمال کے ساتھ گنوار پن کا تاثر وابستہ ہو گیا۔ حتیٰ کہ

1960ء کی دہائی میں ہسپانوی حکومت نے چند کاروباری اداروں کے ساتھ مل کر امریکہ سے سویابین درآمد کر کے کاشت کرنا شروع کر دیا۔ لاکھوں ایکڑ پر پھیلے ہوئے زیتون کے درخت کاٹ کر پھینک دیے گئے، اوران کی جگہ سویابین کی فصل اگا دی گئی جسے بہت زیادہ پانی کی ضرورت پڑتی ہے۔

لیکن 1970ء کے بعد سے رفتہ رفتہ زیتون کے تیل کے طبی فوائد سامنے آنے لگے اور دنیا بھر میں 'میڈی ٹرینین ڈائیٹ' کا چرچا ہونے لگا جس کا اہم جزو زیتون کا تیل ہے۔ اس کے بعد سے سپین کے کاشت کار بھی جاگے اور انھوں نے ازسرِنو زیتون پر توجہ دینا شروع کر دی، لیکن اس دوران اٹلی دنیا بھر میں زیتون کی مارکیٹ پر قبضہ جما چکا تھا۔ چناں چہ آج سپین سے زیتون کا تیل اٹلی جاتا ہے جہاں سے اسے ڈبوں میں بند کر کے اور 'میڈ اِن اٹلی' کی مہر لگا کر دساور کو روانہ کر دیا جاتا ہے۔

میڈی ٹرینین ڈائیٹ کی اہم خصوصیات یہ ہیں: تازہ پھل اور سبزیاں، مچھلی، انڈے، پنیر اور دہی کا زیادہ استعمال، سرخ شراب کم مقدار میں اور بڑا گوشت کم سے کم، اور چربی کے لیے صرف زیتون کا تیل۔ سائنسی تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے کہ میڈی ٹرینین ڈائیٹ خاص طور پر دل کے لیے بہت مفید ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بحیرۂ روم کے آس پاس کے علاقوں میں جہاں اس قسم کی خوراک کھائی جاتی ہے، دل کی بیماریاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اندلس کے عظیم فلسفی ابنِ رشد نے زیتون کے تیل کے بارے میں آج سے نو سو سال پہلے لکھا تھا:

> جب پکے ہوئے صحت مند درختوں سے زیتون کا خالص تیل حاصل کیا جاتا ہے، ایسا تیل جس میں کچھ اور نہ ملایا گیا ہو، تو انسانی جسم اسے بڑی عمدگی سے ہضم کر لیتا ہے۔ جو خوراک زیتون کے تیل میں پکائی گئی ہو وہ لذت اور غذائیت سے بھرپور ہوتی ہے، بشرطیکہ تیل تازہ ہو۔ زیتون کا تیل صحت بخش ہے اس لیے اندلس میں صرف یہی وہ تیل ہے جو گوشت پکانے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے پکانے کا جو طریقہ ہم تجویز کرتے ہیں وہ کچھ یوں ہے: تھوڑا سا تیل لے کر اسے ہانڈی میں ڈالیں، اس کے اندر گوشت ڈال کر تھوڑا تھوڑا کر کے گرم پانی ملاتے جائیں۔ آنچ دھیمی رکھیں تا کہ پانی ابلنے نہ پائے۔

یہ تو ہم جانتے ہی ہیں کہ ابنِ رشد نرے فلسفی ہی نہیں تھے، بلکہ حکیم بھی تھے، لیکن اس تحریر سے ان کی کھانے پکانے کے فن پر دسترس کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

آدھے گھنٹے کے مزید سفر کے بعد ہم اینتی کویرا کے قریب پہنچ گئے۔ موٹروے قصبے سے دامن بچا کر چلتی گئی، تاہم ایک ٹھگنی سی پہاڑی کے دامن میں اینتی کویرا کے قدیم شہر کی سرخ کھپریل کی چھتیں اور درجنوں گرجوں کے مینار دور سے نمایاں ہونے لگے۔ یہیں سے ہِکا سو کے شہر مالقہ کو جانے والی A-45 شاہراہ ایک فلائی اوور کے ذریعے گزرتی ہے۔ بظاہر تو اینتی کویرا خاصا ماڈرن لگتا ہے لیکن آج سے پونے دوسوسال قبل حالات خاصے مختلف تھے۔ واشنگٹن ارونگ رقم طراز ہے:

> یہ قصبہ اس طویل پہاڑی سلسلے کے دامن میں آباد ہے جو وسطی سپین کے عرض میں پھیلا ہوا ہے۔ شہر سے باہر سرسبز کھیتیاں تھیں اور پس منظر میں پہاڑی چوٹیاں۔ ہم ایک اتھلے دریا سے گزرتے ہوئے اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے شہر کے اندر داخل ہوگئے۔ یہ قصبہ اتنا دور افتادہ ہے کہ لگتا ہے ہم ماضی کے کسی دور میں داخل ہو گئے ہیں۔ میں نے یہاں لوگوں کو ایسی ٹوپیاں اور لباس زیبِ تن کیے ہوئے دیکھا جو صرف پرانے زمانے کی تصاویر میں نظر آتے ہیں۔ عورتوں نے بھی پرانی قطع کے چغے اوڑھے ہوئے تھے۔ لگتا ہے اس بستی کو ابھی تک پیرس کے فیشن کی ہوا نہیں لگی!

اگلی صبح میں ٹہلتا ہوا قصبے کے ایک طرف قدیم مسلم قلعے کی طرف چلا گیا۔ یہاں ایک شکستہ مینار کے سائے میں بیٹھ کر پوری بستی صاف دکھائی دیتی تھی۔ اس تاریخی بستی کا نام کئی کتابوں اور لوک داستانوں میں ملتا ہے۔ میں سوچنے لگا کہ اس قلعے اور اس مینار کے آس پاس کیا کیا معرکے لڑے گئے ہوں گے، مسلمان اور عیسائی سورماؤں نے بہادری اور جواں مردی کے کیا کیا جوہر دکھائے ہوں گے۔ یہیں سے مالقہ پر حملے کی تیاریاں کی گئی تھیں اور اس ہولناک خوں ریزی کی منصوبہ بندی کہیں آس پاس ہی کی گئی ہوگی جس نے تمام اندلس کو ماتم کدہ بنا دیا تھا۔ میں خاصی دیر تک بیٹھا انہی باتوں کے بارے میں سوچنے کے بعد میں بستی کی سمت اترنے لگا تو فضا میں چرچ کی گھنٹیوں کی آوازیں گھل رہی تھیں۔

....

مالقہ

اگلے دن علی الصباح میں نے سہیل کے عمل دار اور ایک حفاظتی دستے کے جلو میں سفر شروع کیا اور بغیر خاص واقعے کے مالقہ پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ مالقہ اندلس کے خوب صورت ترین شہروں میں سے ایک ہے۔ اس کے ایک طرف سمندر ہے اور دوسری جانب وسیع زرعی اراضی۔ قدرت نے اسے ہر قسم کی اجناس، پھلوں اور سبزیوں سے دل کھول کر نوازا ہے۔ میں نے اس کے بازاروں میں ایک درہم کے بے حد شیریں انگور بکتے دیکھے۔ مالقہ کے لعل سے زیادہ خوشنما انار کا دنیا بھر میں کوئی جواب نہیں۔ اور اگر انجیر اور بادام کا پوچھیں تو وہ مالقہ سے مشرق اور مغرب میں برآمد کیے جاتے ہیں۔

مالقہ کے لوگ صنعت و حرفت میں بھی طاق ہیں۔ میں نے یہاں بے حد نفیس برتن بنتے دیکھے، جن پر انتہائی خوب صورت ملمع کاری کی جاتی ہے۔ یہ برتن دور دراز کی سرزمینوں میں فروخت کیے جاتے ہیں۔ اور یہاں کی جامع مسجد کے حسن کا کیا کہنا۔ اس کے صحن میں مالٹے کے بے حد اونچے درخت لگے ہوئے ہیں جو نمازیوں کو دھوپ کی شدت سے بچانے کے ساتھ ساتھ مسجد کی دلکشی میں بھی اضافہ کرتے ہیں۔

مالقہ کا قلعہ بھی دیکھنے کی چیز ہے۔ یہ شہر کے پہلو میں ایک اونچی پہاڑی پر شہر کے اوپر یوں سایہ فگن ہے جیسے کوئی مشفق باپ اپنے بچوں کی حفاظت پر ہمہ وقت مستعد ہو۔ اس قلعے کی گزوں چوڑی سنگی دیواریں اور فلک خراش برج و بارو شہریوں کے دلوں کو تقویت فراہم کرتے ہیں۔

عصر کے بعد میں اپنے پرانے معمول کے مطابق گلیوں اور بازاروں کی سیر کے لیے نکلا۔ میں نے دیکھا کہ ایک پُر رونق بازار میں کچھ لوگ چندہ اکٹھا کر رہے ہیں۔ سن گن لینے پر معلوم ہوا کہ یہ لوگ ان بدنصیب گھڑسواروں کی رہائی کے لیے تاوان کی رقم جمع کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جنھیں قزاقوں نے یرغمال بنا رکھا ہے۔ میں نے اپنی استطاعت کے مطابق چندے میں حصہ ڈالا اور جامع مسجد میں جا کر ایک بار شکرانے کے نفل پڑھے کہ خدا نے مجھے اس انجام سے محفوظ رکھا۔

....

آرکی دونا

آرکی دونا اب تک A-92 پر ملنے والے قصبوں سے تھوڑا مختلف ہے۔ تاحدِ نظر پھیلے ہوئے

میدانوں کے بیچوں بیچ دو پہاڑیاں ابھری ہوئی ہیں اور ان میں سے ایک کے عین دامن میں آرکی دونا کا سفید قصبہ بکھرا ہوا ہے۔ ویسے تو اندلوسیا میں جگہ جگہ چونا کیے ہوئے مکانات نظر آتے ہیں لیکن آرکی دونا پورے کا پورا بگلے کی طرح سفید ہے۔ قصبے کے باہر نیلے رنگ کا سائن بورڈ نصب ہے، غرناطہ 77 کلومیٹر۔ اس قصبے کی حدود سے باہر اروِنگ کو ایک فقیر ملا، جس سے اس کی بڑی دل چسپ ملاقات رہی:

> ہم نے فقیر کو کھانا دیا۔ وہ ہم سے کچھ دور بیٹھا اور بڑے سلیقے سے آہستہ آہستہ کھانے لگا۔ اس کی وضع قطع، چال ڈھال اور گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے کبھی اچھے دن دیکھ رکھے ہیں۔ میں نے تھوڑا کریدا تو اس نے باتیں شروع کر دیں۔ وہ ہمیشہ سے فقیر نہیں تھا بلکہ اس کے پاس بھیڑوں کا ریوڑ تھا، لیکن مرورِ زمانہ نے سب کچھ چھین کر اسے بھیک مانگنے پر مجبور کر دیا۔

وہ مالقہ سے آرہا تھا اور اپنے آبائی شہر آرکی دونا جا رہا تھا۔ اس نے دو دن سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ فقیر نے آرکی دونا کے پیچھے پہاڑی پر ایستادہ پرانے قلعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: 'جب غرناطہ پر قبضے کے لیے مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان جنگ جاری تھی تو یہ قلعہ ایک مسلمان امیر کی کمان میں تھا۔ ملکہ ازابیلا نے ایک بڑے لشکر کے ساتھ اس قلعے پر چڑھائی کی۔ امیر نے اپنے بادلوں میں گھرے ہوئے قلعے کی برجیوں سے جھانک کر نیچے ازابیلا کے لشکر کو دیکھا تو حقارت سے ہنس پڑا۔ قلعہ ناقابلِ تسخیر تھا۔ لیکن مقدس مریم نے ازابیلا کے خواب میں آکر اسے پہاڑوں کے اندر سے ایک ایسا راستا دکھلا دیا جس کا اس سے پہلے کسی کو علم نہیں تھا۔ جب امیر نے ازابیلا کے لشکر کو قلعے کے اندر آتے دیکھا تو حیرت اور خوف کے مارے اپنے گھوڑے سمیت برج سے کود کر پاش پاش ہو گیا۔

'اس کے گھوڑے کے سموں کے نشان آج تک سامنے والی چٹان پر قائم ہیں۔' فقیر نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ 'اور میرے محترم میزبانو، اس پہاڑ پر وہ راستا جا رہا ہے جس سے گزر کر ازابیلا کا لشکر قلعے کے اندر پہنچا تھا۔' فقیر نے بتایا۔ 'کرامت یہ ہے کہ یہ راستا دور سے تو نظر آتا ہے، لیکن جب قریب پہنچیں تو آپ ہی آپ غائب ہو جاتا ہے،' فقیر نے ہماری معلومات میں

اضافہ کیا۔ اس نے اسی طرح کی کئی اور کہانیاں بھی سنائیں، جن میں مسلمانوں کے دور کے خفتہ خزانوں کا ذکر تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ سپین کے نچلے طبقوں میں ایسی داستانیں بہت مقبول ہیں اور بہت سے لوگ یہ آس لگائے بیٹھے ہوتے ہیں کہ کبھی نہ کبھی ان کے ہاتھ سونے اور جواہر سے بھرے صندوق آئیں گے۔

....

لوہہ

آرکی دونا سے کچھ ہی آگے پہاڑی سفر شروع ہو گیا۔ لیکن یہ ہمارے پہاڑوں کی طرح فلک جنگ قسم کے پہاڑ نہیں ہیں بلکہ بڑے دھیمے مزاج کے، ہلکے پھلکے اور بے ضرر سے پہاڑ ہیں۔ انہی پہاڑوں، بلکہ پہاڑیوں کے درمیان ایک نشیبی وادی میں لوہہ کے آثار نظر آئے۔ یہاں بھی سرخ چھتوں اور سفید دیواروں کا راج ہے۔ شاید سامنے نظر آنے والی پہاڑیوں میں وہ درّہ ہے جس تک پہنچتے ہوئے واشنگٹن ارونگ کو خاصی مشکل کا سامنا کرنا پڑا تھا:

> اگلے روز ہمیں ایک سخت چڑھائی والی پہاڑی پر چڑھ کر ایک درے سے گزرنا پڑا۔ یہ وہی راستا ہے جہاں سے گزر کر فرڈیننڈ کی فوج غرناطہ پہنچی تھی۔ اس درے کو شاہی درہ کہا جاتا ہے۔ سورج کے افق پر ڈوبتے ڈوبتے ہم لویا شہر پہنچ گئے۔ اس شہر کو غرناطہ کی کنجی کہا جاتا ہے۔ یہیں فرڈیننڈ اور مسلم جرنیل علی عطار کے درمیان فیصلہ کن جنگ لڑی گئی تھی۔

اگلے دن ہم لویا سے اتر کر ایک کھلے میدان میں پہنچے۔ غرناطہ کا مشہور سبزہ زار ہمارے قدموں میں بچھا ہوا تھا۔ سامنے ہی الحمرا کے سرخ میناروں کے دامن میں غرناطہ کا افسانوی شہر نظر آ رہا تھا، اور صبح کی دھوپ میں شہر کے پس منظر میں سیرا نیوادا کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں چاندی کی طرح چمک رہی تھیں۔

....

غرناطہ سے کچھ ہی پہلے سانتا فے کا چھوٹا شہر ہے۔ 1491ء میں فرڈیننڈ اور ازابیلا کی فوجوں نے غرناطہ کا محاصرہ کر رکھا تھا کہ اچانک آگ لگ گئی اور آن کی آن میں تمام کیمپ خاکستر ہو گیا۔ شاہی جوڑے نے پتھروں سے نیا شہر تعمیر کروایا اور اس کا نام سانتا فے، یعنی 'مقدس عقیدہ'

رکھا۔ اس وقت پورے سپین میں یہ واحد شہر تھا جس پر کبھی مسلمانوں نے حکومت نہیں کی تھی۔

سانتافے سے کچھ پہلے دائیں طرف ایک نیلے بورڈ پر 'فیدریکوگارسیالورکا ایرپورتو' لکھا نظر آیا۔ ڈان ہوان سے استفسار کیا تو اس نے بتایا کہ عظیم ہسپانوی شاعر لورکا یہیں ایک گاؤں میں پیدا ہوا تھا۔ میرے سوال سے ڈان ہوان کے ذوقِ کلام کو اس قدر مہمیز لگی کہ اس نے مائیک اٹھا کر نہ صرف لورکا کے حالاتِ زندگی بلکہ اس کے فن پر بھی اچھا خاصا مقالہ سنا ڈالا۔

نسیم حجازی نے اپنے ایک ناول میں ایک جگہ لکھا ہے کہ مسلم فوج کو الحمرا کے گنبد دور ہی سے نظر آنا شروع ہو گئے۔ ڈان ہوان کی طرف سے ٹھوکا دینے پر سب مسافروں نے کھڑکیوں سے پردے ہٹا ہٹا کر اور گردنیں لمبی کر کر کے الحمرا کی ایک جھلک پانے کی کوشش کی۔ میں نے بھی غور سے دیکھا۔ مجھے بھورے رنگ کی کچھ قلعہ نما اونچی فصیلیں اور مینار تو نظر آئے، لیکن گنبدوں کا کوئی سراغ نہ ملا۔ پھر یہ منظر بھی سڑک کے کنارے بنے سفید اور بھورے فلیٹوں کے پیچھے گم ہو گیا۔ میں بھی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور اپنا سامان بیگ میں ڈالنے لگا۔

....

غرناطہ

مالقہ سے اگلی منزل غرناطہ کی تھی۔ کئی پہاڑی شاہ راہوں پر سفر اور الحمہ شہر سے گزرنے کے بعد میں بالآخر غرناطہ پہنچ گیا۔ شانِ اندلس، عروس البلاد غرناطہ، جس کی دنیا بھر میں کوئی نظیر نہیں۔ اس کی حدود چالیس میل دور سے شروع ہو جاتی ہیں۔ اس علاقے کو دریائے شنیل اور دوسری کئی چھوٹی بڑی ندیاں سیراب کرتی ہیں۔ دریا کے دونوں اطراف بے حد زرخیز زرعی اراضی ہے، جس میں انواع و اقسام کی نعمتیں اگتی ہیں۔ شہر کے چاروں طرف باغات، گلزار، پھل دار درختوں کے قطعات اور تاکستان پھیلے ہوئے ہیں۔ یہاں سب سے قابلِ ذکر جگہ عین الدمہ یعنی آنسوؤں کا چشمہ کہلاتی ہے۔ یہ غرناطہ سے تھوڑی دور ایک چھوٹی سی بے حد حسین پہاڑی ہے جو باغات سے گھری ہوئی ہے۔ یہاں جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے چشمے بہتے ہیں اور دیکھنے والے کی آنکھوں کو فرحت عطا کرتے ہیں۔

میں جس دور میں غرناطہ پہنچا اس وقت وہاں سلطان ابوالحجاج یوسف اول کی حکمرانی تھی۔ میرے غرناطہ آمد کی خبر سن کر سلطان نے اپنی علالت کے باوجود بندہ پروری کا ثبوت دیتے ہوئے

مجھے اپنی قدم بوسی کے لیے طلب کیا۔

میں شاہی ہرکاروں کے ساتھ غرناطہ کے اوپر سایہ کناں پہاڑی پر چڑھ کر الحمرا کے مشہورِ زمانہ سرخ محل تک پہنچا۔ یہاں میں نے دیکھا کہ الحمرا کو محل کہنا ٹھیک نہیں ہے، کیوں کہ یہ اپنی ذات میں ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ یہاں ایک فوجی چھاؤنی قائم ہے، شاہی دفاتر ہیں اور دکانیں ہیں، لہلاتے ہوئے باغات ہیں، کئی مدرسے ہیں حمام ہیں اور مساجد قائم ہیں۔ یہاں کئی ہزار لوگ آباد ہیں۔

....

سیئیرا نوادا کی برف پوش چوٹیوں کے دامن میں آباد غرناطہ خوب صورت اور بے حد صاف ستھرا شہر ہے۔ آپ کے ذہن میں بعض شہروں کا بے حد رومانوی بلکہ دیومالائی سا تصور ہوتا ہے، غرناطہ بھی انہی میں سے ایک ہے۔ اردو زبان میں اس شہر کے بارے میں اتنے ناول، اور کہانیاں لکھی گئی اور ڈرامے اور فلمیں بنائی گئی ہیں کہ غرناطہ کا نام سنتے ہیں انسان افسانوی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ لیکن دوسرے تمام شہروں کی طرح غرناطہ بھی ایک شہر ہی ہے۔ کسی بھی عام شہر کی طرح۔ یہاں بھی شہر کے آغاز میں سڑک کے دونوں طرف پٹرول پمپ، ٹائروں اور کار مکینکوں کی ورکشاپیں، گاڑیوں کے شوروم، سستے موٹل، اور فاسٹ فوڈ ریستوران نظر آتے ہیں۔ عورتیں اپنے معمول کے مطابق رات کا کھانا پکانے کے لیے سبزی اور گوشت خرید رہی ہیں۔ لوگ اپنے اپنے معمول کے کاموں میں مشغول ہیں۔ بچے سکولوں سے گھروں کو جاتے ہوئے حسب معمول شور مچاتے ہوئے گلیوں میں سے دوڑ کر گزر رہے ہیں۔

غرناطہ میں الحمرا کی پہاڑی سے پیچھے ایک ہوٹل ہمارے گروپ کے لیے مختص کیا گیا تھا۔ ہوٹل میں پہنچ کر نہا دھو کر جب میں باہر نکلا تو سورج غروب ہو چکا تھا۔ الحمرا ہوٹل سے پیدل فاصلے پر تھا، لیکن پہاڑی کا یہ رخ اونچے درختوں سے ڈھکا ہوا تھا جن کے پیچھے الحمرا بھی چھپ گیا تھا۔ میں رات گئے تک غرناطہ کی سڑکوں پر بے مقصد گھومتا رہا۔

اگلے دن صبح سویرے گاڑی آ گئی اور ہمارا کارواں الحمرا کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس بار ماریہ نامی ایک مقامی خاتون ہماری رہبری کے فرائض سرانجام دے رہی تھی۔ ماریہ نے انگلستان سے تعلیم حاصل کی تھی اس لیے اس کا انگریزی لہجہ صاف اور شستہ تھا۔ بے پروائی سے پہنے ہوئے

سیاہ لباس، نظر کی عینک، اور پشت پر کسے ہوئے بیک پیک کی وجہ سے وہ یونیورسٹی کی طالبہ معلوم ہو رہی تھی۔

الحمرا میں روزانہ ہزاروں سیاح آتے ہیں۔ محل کی نزاکت کو ملحوظ رکھتے ہوئے انتظامیہ نے داخلے کے مخصوص اوقات مقرر کر رکھے ہیں۔ اس کے علاوہ ٹکٹ پر وہ ٹائم بھی لکھا ہوتا ہے جس سے پہلے پہلے آپ کو ہر حال میں باہر نکلنا ہوتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ایک وقت میں مخصوص تعداد سے زیادہ لوگ اندر نہ جا پائیں اور محل کے اندر زیادہ بھیڑ بھاڑ نہ ہو۔ ہمارے گروپ کی باری کا انتظار کرتے ہوئے ماریہ نے بتایا کہ محل کا نام الحمرا (یعنی سرخ) رکھے جانے کی دو وجوہات بیان کی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ محل جس پہاڑی پر قائم ہے اس کی مٹی لوہے کی آمیزش کی وجہ سے سرخی مائل ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ نویں صدی میں الحمرا کی بنیادیں نصری خاندان کے اولین امیر محمد بن الاحمر بن نصر نے رکھی تھیں، جسے اس کی سرخی مائل رنگت کی مناسبت سے الاحمر کہا جاتا تھا۔

....

میں الحمرا کے صدر دروازے کے قریب پہنچا۔ محل کیا تھا، سیسہ پلایا قلعہ لگ رہا تھا۔ نہ کوئی خوش نما گنبد، نہ آسمان کو چھو لینے والے مینار، نہ پچی کاری سے مزین فصیلیں۔ میں شک و شبے کا شکار ہو گیا کہ اس کے حسن کے جو افسانے ایران اور ہندوستان تک مشہور ہیں، معلوم نہیں ان میں کس حد تک صداقت ہے۔ میں نے اپنے لاکھوں میل کے اسفار کے دوران سینکڑوں بار مسلّمہ سمجھے جانے والے اساطیر کو چکنا چور ہوتے دیکھا تھا۔ چین میں موتیوں سے بنے ہوئے شہر، ملایا میں مگر مچھ نما انسانوں کی حکومت، سمندروں میں جل پریوں کے قصے، یہ سب باتیں بعد میں حقیقت کی بجائے لوگوں کے زرخیز تخیل کی کارفرمائی ہی ثابت ہوئی تھیں۔ تو کیا الحمرا بھی اسی قبیل کا کوئی افسانہ ہی ہے؟

جب میں سپاٹ دیواروں اور مربع شکل کی چوبرجیوں سے گزر کر صدر دروازے میں داخل ہوا تو شام کے سائے ڈھل رہے تھے۔ اندر داخل ہوتے ہی مجھے جھٹکا سا لگا۔ جیسے صحرا میں چلتے چلتے یک لخت نخلستان سامنے آ جائے۔ جیسے اچانک کھڑکی سے پردہ کھینچ لیا جائے اور کمرا روشنی سے شرابور ہو جائے۔ میں نے چین کے عظیم خاقان قبلائی خان کا دربار دیکھا تھا۔ ہندوستان کے سلطانِ عالی مقام محمد بن تغلق کے محلات میں سالہا سال گزارے تھے۔ قسطنطنیہ کے عظیم آیا صوفیہ

کے گنبد کا محیط دیکھا تھا، لیکن جو میں اب دیکھ رہا تھا، اس جیسا کوئی نظارہ کبھی ان آنکھوں کے سامنے نہیں گزرا تھا۔ میرا قلم ان مناظر کی تصویر کھینچنے سے قاصر ہے، بس وہ نقش ونگار میرے پردۂ دماغ پر کندہ ہیں اور میں جب بھی مغموم ہوتا ہوں تو آنکھیں بند کر اس نظارے کو اپنے ذہن میں مجسم کر لیتا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ محل کی دیواروں پر مشعلیں آویزاں ہیں، جن کی روشنی دیواروں پر گل بوٹوں کو منور کر رہی ہیں۔ صحن میں چنبیلی اور سرخ گلاب کی خوشبو مشامِ جاں کو معطر کیے جاتی تھی۔ محل کے اندر جگہ جگہ پانی کی چھوٹی چھوٹی نالیاں قرآنی آیت **جنات تجری من تحتھا الانھار** کی تصویر پیش کر رہی تھیں، حور صورت کنیزیں حریری لبادوں میں ملبوس ادھر ادھر آجا رہی تھیں اور دور کہیں سے عود کے مدھم سرفواروں کی رل ترل میں مدغم ہو رہے تھے۔

میری پھٹی پھٹی نگاہیں آس پاس کے مناظر پر کچھ اس طرح سے جمی تھیں کہ چلتے چلتے مجھے کئی بار ٹھوکر لگی اور ایک بار تو میں فوارے میں گرتے گرتے بچا۔ شاہی منصب دار نے مجھے ٹہوکا دے کر خبردار کیا کہ اب ہم شاہی حجلہ خانے تک پہنچنے والے ہیں چناں چہ آداب ملحوظ رکھے جائیں۔

....

مسجدِ قرطبہ کی طرح الحمرا کے باہر سے کچھ پتا نہیں چلتا کہ اندر عمارت کس قسم کی ہو گی۔ کھردری، سنگی دیواریں، فوجی انداز کے برج، گراں ڈیل دروازے۔ بلکہ باہر سے عمارت ایک قدیم عظیم الجثہ بحری جہاز کی طرح لگتی ہے۔ محل کا اگلا حصہ 'القصبہ' بالکل جہاز کے عرشے کی طرح منھ اٹھائے کھڑا ہے جو کسی انجانی منزل کی طرف کوچ کرنے کے لیے امیر البحر کے اشارے کا منتظر ہے۔

لیکن جب ماریہ کی قیادت میں ہم 'پورتا دی لا جستس' (بابِ عدل) سے گزر کر اندر داخل ہوئے تو مارے حیرت کے آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ دروازے کے اوپر لکڑی کی محراب اور آمنے سامنے کی دیواروں پر اس قسم کے نفیس نقش کھدے تھے کہ یقین نہیں آتا تھا کہ انسانی ہاتھوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ میں نے جھٹ گردن میں پڑا ہوا کیمرا اتارا اور کھٹا کھٹ تصویریں بنانے لگا۔ ماریہ نے ہنستے ہوئے کہا کہ ذرا حوصلہ، یہ تو اپیٹا ئزر ہے، ابھی مین کورس شروع نہیں ہوا! ایک اور دروازے سے گزرے تو پتا چلا کہ واقعی پچھلا ہال تو کچھ نہیں تھا۔ پھر ایک غلام گردش آئی جس نے ہال کی یادیں بھلا دیں۔ اسی طرح الحمرا کی تہیں اطلس کے تھان کی طرح کھلتی گئیں، اور ایک سے

بڑھ کر ایک نظارہ سامنے آتا رہا۔ اس پر مجھے الف لیلہ کی ایک کہانی یاد آ گئی: کوئی مسافر ایک زیرِ زمین محل میں چلا گیا، جس کی شان و شوکت اور وہاں موجود پری چہرہ کنیزوں کے حسن و جمال نے اس کو دنیا و مافیہا سے بیگانہ کر دیا۔ آخر بارہ برس بعد جب اس نے ایک دروازہ کھولا تو معلوم ہوتا ہے کہ آگے تو سینکڑوں گنا زیادہ پر آسائش محل اور کہیں زیادہ حسین و جمیل کنیزیں موجود ہیں۔ (تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا!)

الحمرا کی دیواروں پر جگہ جگہ **و لا غالب الا اللہ** (اللہ کے سوا کوئی فاتح نہیں) کندہ کیا ہوا نظر آتا ہے۔ ماریہ نے بتایا کہ نصری خاندان کے بانی اور الحمرا کے بنیاد گزار الاحمر ایک بار کسی جنگی معرکہ مار کر غرناطہ لوٹے تو عوام نے ان کا پر جوش استقبال کرتے ہوئے الغالب الغالب کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ اس پر الاحمر نے یہ فقرہ کہا جو بعد میں نصری خاندان کا ماٹو بن گیا۔

ماریہ نے تنبیہ کی کہ کسی دیوار کو ہاتھ نہ لگایا جائے کیوں کہ پلستر پر بنے نقش و نگار اتنے نازک ہیں کہ انھیں انگلی مار کر توڑا جا سکتا ہے۔ یہ الحمرا کا داخلی تضاد ہے، جو کچھ کچھ اقبال کے مردِ مومن سے ملتا ہے: باہر سے فولاد، اندر سے ریشم۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہ طلسم کدۂ حیرت جو ہاتھ لگانے سے کملایا جاتا ہے، اتنی صدیوں تک قائم کیسے رہ گیا۔ شاید ان کہانیوں میں کچھ حقیقت ضرور ہے جن میں کہا گیا ہے کہ الاحمر بڑے پہنچے ہوئے جادوگر تھے اور انھوں نے اپنے محل پر وقت کی یورش کے خلاف حصار کھینچ رکھا ہے۔

الحمرا کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کے در و دیوار اور سقف و بام کی نقاشی ہے، جس میں خوش نما جیومیٹریکل پیٹرن ان تھک آہنگ اور توازن سے دہرائے گئے ہیں۔ یہ وہی آہنگ و توازن ہے جو تمام اسلامی آرٹ، بشمول موسیقی اور شاعری میں پایا جاتا ہے۔ لا متناہیت کا جو تاثر مسجدِ قرطبہ کی قطار در قطار محرابیں پیدا کرتی ہیں، یہاں وہی کام نقش و نگار سے لیا گیا ہے جو تقسیم در تقسیم ہوتے ہوئے ہر سمت میں یوں پھیل کر ہم آہنگ ہو جاتے ہیں کہ پتا نہیں چلتا ڈیزائن کہاں سے شروع ہوا تھا اور کہاں پر ختم ہو رہا ہے۔ مشہور مستشرق ٹائٹس برک ہارٹ لکھتے ہیں کہ مغرب کے تصویری آرٹ اور اسلامی ڈیزائن آرٹ میں بنیادی فرق ہے۔ پینٹنگ نظروں کو اپنے حصار میں لے کر انسان کو کسی فرضی منظر کے اندر لے جاتی ہے، جس میں کسی ایک لمحے کو گرفت میں لیا ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے پر اسلامی پیٹرن اور ایرابیسک نظروں کو کسی ایک جگہ پر مقید کرنے کی بجائے

انھیں کھلا چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ تمام تخلیق کے اندر آزادی سے اس طرح پھریں کہ دیکھنے والے کا ذہن کسی مخصوص خیال یا سوچ سے ماورا ہو کر وقت کی قید سے آزاد ہو جائے۔ یہ ایسا ہی تجربہ ہے جو آپ کو برف کے گالے، الاؤ میں جلتی آگ، آسمان پر لہراتے بادل، یا پانی کی لہریں تکتے رہنے سے حاصل ہوتا ہے۔ پینٹنگز کو دیکھنے کے برعکس یہاں آپ کو ایک قسم کا اندرونی شانتی نصیب ہوتی ہے جو وجود کی گہرائیوں سے پھوٹتی ہے۔

....

امیرِ غرناطہ یوسف ابوالحجاج اپنی بیماری کے باوجود خاصے چاق و چوبند دکھائی دیے۔ ان کے سفید دانت مشعل کی روشنی میں دُرِیمن کی مانند چمکتے تھے، آنکھیں بڑی بڑی اور خوب روشن تھیں، آواز صاف اور لہجہ متین تھا جو کانوں میں رس گھولتا تھا۔ ان کی داڑھی لمبی، سیاہ اور خوش نما تھی۔ البتہ لگتا تھا کہ داڑھی کے بال اصلاً سرخ ہیں اور انھیں سیاہ مہندی سے رنگا گیا ہے۔ انھی نے الحمرا کی تعمیر مکمل کی تھی اور بابِ عدل بھی انھوں نے ہی تعمیر کروایا تھا۔ گفتگو کے دوران جب میں نے اپنے سفرِ چین کی مختصر روداد سنائی تو انھوں نے بیچ میں دو تین ایسے سوالات کیے جن سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ قدرت نے امیر کو غیر معمولی ذکاوت سے نوازا ہے۔ انھیں فنِ تعمیر سے خاص لگاؤ تھا اور انھوں نے مختلف ممالک کی چیدہ چیدہ عمارات کے بارے میں خاص طور پر سوالات کیے۔

امیر کی والدہ ماجدہ نے بھی میری آمد کی خبر سن کر کمال بندہ پروری سے میری پذیرائی کی اور میرے خرچ کے لیے مٹھی بھر اشرفیاں بھجوادیں، جو بڑے کام آئیں۔

غرناطہ میں میری ملاقات ممتاز علما اور فقہا کے علاوہ یہاں کے شیخ سے بھی ہوئی جو غرناطہ کے صوفی سلسلوں کے سربراہ ہیں۔ میں نے چند دن شیخ کی درس گاہ میں گزارے جو شہر سے آٹھ میل دور البیرہ شہر کے کھنڈرات کے قریب واقع ہے۔ درس گاہ ایک پہاڑی چوٹی پر بنائی گئی ہے جو العقاب کہلاتی ہے۔ اسی سے متصل ایک خیراتی اقامت گاہ بھی قائم ہے جہاں یتیموں اور بے گھروں کو مفت طعام و قیام کی سہولت دی جاتی ہے۔

میں نے غرناطہ میں ایک ایسی خوراک کھائی جو پہلے کبھی دیکھنے سننے میں نہیں آئی تھی۔ یہ الاندلس کا خاص توشہ ہے۔ اس میں ایک گائے کے پیٹ میں بکری، بکری کے پیٹ میں مرغابی، مرغابی کے پیٹ میں مرغی، مرغی کے پیٹ میں بٹیر، اور بٹیر کے پیٹ میں انڈا رکھ کر ان سب کو دھیمی

آنچ پر دم پخت کیا جاتا ہے۔

....

الحمرا کے مغربی کونے میں واشنگٹن ارونگ کا کمرا ہے جہاں اس نے کئی مہینے گزارے تھے۔ یہیں اس نے اپنی مشہور کتاب 'الحمرا' لکھی تھی۔ واشنگٹن ارونگ وہ شخص ہے جس نے مغرب میں اسلام کو مثبت انداز سے متعارف کروایا۔ اسی کی بدولت سپین میں مسلمانوں کے ماضی کی عظمت مغربی دنیا پر آشکارہ ہوئی۔ ارونگ نے متعدد کتابوں میں الحمرا اور مسلم اندلس کا وہ رومانوی تصور پیش کیا جو آج سوشل لینڈ سکیپ کا حصہ بن گیا ہے۔ الحمرا کے بارے میں ارونگ کا اشتیاق دیکھ کر غرناطہ کے گورنر نے اس کے لیے الحمرا کے دو کمرے صاف کرا دیے تھے۔ ارونگ لکھتا ہے کہ 'آپ یقیناً میری خوش بختی پر ناز کریں گے۔ ذرا سوچیں، میں الحمرا میں رہتا ہوں، ابوعبداللہ کے شاہی محل الحمرا میں۔ یہاں میں بھی اپنے آپ کو عرب سلطان سمجھتا ہوں!'

الحمرا کے محلات کے پہلو میں فرڈیننڈ اور ازابیلا کے پوتے شہنشاہ کارلوس پنجم کا تعمیر کردہ محل ہے۔ یہ وہی کارلوس ہے جس کے دور میں مسجدِ قرطبہ کے وسط میں کلیسا تعمیر کیا گیا تھا، اور جس کو دیکھ کر اس نے کہا تھا کہ جو تم نے بنایا ہے وہ کہیں بھی بنایا جا سکتا تھا لیکن جو تم نے ڈھایا ہے وہ دنیا میں کہیں اور نہیں ہے۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ خود کارلوس پنجم کی حکومت نصف یورپ پر تھی، وہ اپنا محل کہیں بھی بنا سکتا تھا۔ کسی بھی اور جگہ یہ محل بہت بارعب بلکہ شاندار لگتا، لیکن الحمرا کے نرم و نازک ریشمیں مخملیں محلات کو دیکھنے کے بعد جب اس پر نظر پڑتی ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے سیم بدن مہ جبینوں کے جھرمٹ میں ایک بے ہنگم دیو گھس آیا ہے۔ یہ عمارت اندر سے محل کم اور بل فائٹنگ کا اکھاڑا زیادہ لگتی ہے۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ کارلوس نے الحمرا کے سرمائی محل کو ڈھا کر اسے تعمیر کروایا تھا۔

الحمرا کے اندر ہمارے تین گھنٹے گویا منٹوں میں ختم ہو گئے۔ محلات سے نکل کر اپنے آپ کو بیرونی دنیا سے ہم آہنگ کرتے ہوئے تھوڑی دیر لگ گئی۔ جنت العریف کے مشہور باغات سے گزرتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ ممکن ہے الحمرا کا آخری تاج دار محمد دوازدہم ابوعبداللہ آخری بار اسی راستے سے گزر کر فرڈیننڈ اور ازابیلا کو اپنے اجداد کے تعمیر کردہ حرم کی کنجیاں پیش کرنے گیا ہو۔ روایت ہے کہ اس نے درخواست کی تھی کہ وہ جس دروازے سے آخری بار نکلے، اسے پاٹ

دیا جائے تاکہ آئندہ کوئی اس دروازے سے نہ گزر سکے۔ فرڈیننڈ نے یہ درخواست منظور کرتے ہوئے دروازہ چنوادیا تھا۔ اس وقت ابوعبداللہ کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی؟ وہی جو آدم کے دل پر جنت سے نکلتے وقت گزری ہوگی؟

نسیم حجازی نے پنجابی فلموں سے بڑھ کے بلیک اینڈ وائٹ جذباتیت کے مرقع ناول 'شاہین' میں ابوعبداللہ کو نفرت انگیز ولین قرار دے کر سقوطِ غرناطہ کا سارا ملبہ اس پر ڈال دیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابوعبداللہ تاریخ کے دھارے کی مخالف سمت میں تیر رہا تھا۔ سقوطِ غرناطہ نوشتۂ دیوار تھا، جسے جلد یا بدیر وقوع پذیر ہونا تھا۔ اگر غدار ابوعبداللہ نہ بھی پیدا ہوا ہوتا تب بھی غرناطہ 1492ء میں نہ سہی، پانچ سات برس بعد زیر ہو جاتا۔ اگلے چند عشروں کے اندر اندر سپینش ایمپائر دنیا کی پہلی گلوبل سپر پاور کے روپ میں ابھر کر سامنے آ گئی تھی جس کا غلبہ دنیا کے پانچ براعظموں کے وسیع خطوں پر تھا۔ یورپین استعماریت کی پہلی اینٹ سپین ہی نے رکھی تھی۔ غرناطہ کی چھوٹی سی پسماندہ ریاست بھلا کب تک اس منھ زور سیلاب کے آگے بند باندھ سکتی؟ ہمارے 'ولولہ انگیز' تاریخی ناول نگار یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ غرناطہ کے نصری خاندان کی حکومت کا وجود صرف اور صرف اس لیے تھا کہ وہ قشتالیہ کی باج گزار تھی۔ نہ صرف نصری ہر سال باقاعدگی سے خراج دیا کرتے تھے بلکہ برخورداری اور اطاعت گزاری کا ثبوت دینے کے لیے قشتالیہ کی جنگوں میں اپنے سپاہی اور سامانِ رسد بھی بھیجا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ 1248ء میں جب فرڈیننڈ ثالث نے مسلم اشبیلیہ کا محاصرہ کیا تو الحمرا کے بانی الاحمر نے خود اس جنگ میں پانچ سو منتخب شہسواروں کے ساتھ عیسائیوں کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف شرکت کی تھی۔

آخرکار جب غرناطہ اور عیسائی مدِ مقابل آئے تو اب یہ وہ پرانی جنگ نہیں رہی تھی۔ زمانہ قیامت کی چال چل چکا تھا اور اب یہ جنگ ٹیکنالوجی کی جنگ تھی۔ فرڈیننڈ کی فوج کے پاس اس زمانے کے لحاظ سے جدید ترین توپیں اور بندوقیں تھیں، جب کہ مسلمانوں کا اب بھی بڑی حد تک انحصار تیر و تبر ہی پر تھا۔ مسلمانوں نے مضبوط قلعے بنا رکھے تھے جنھیں روایتی محاصرے میں فتح کرنا ناممکن کے قریب تھا، لیکن فرڈیننڈ کے پاس غیر روایتی بارودی توپیں اور پتھر کے گولے برسانے والی توپیں تھیں، جن کے سامنے مسلمانوں کے 'سیسہ پلائے' قلعے ریت کے ڈھیر ثابت ہوئے۔ دراصل مسلمانوں کا نہ صرف علمی و سائنسی بلکہ جنگی زوال بھی دو صدیاں پہلے ہی شروع ہو

چکا تھا۔ تاریخ دان لکھتے ہیں کہ 1492ء میں فرڈیننڈ کے پاس 179 توپیں تھیں، جب کہ غرناطہ کی سلطنت کے پاس عیسائیوں سے چھینی ہوئی ایک آدھ توپ کے سوا کچھ نہیں تھا۔

ملکہ ازابیلا نے بارودی ہتھیاروں کی تیاری پر خاص توجہ دی اور اس مقصد کے لیے اٹلی، جرمنی اور فرانس سے ماہر جنگی انجینئر منگوائے۔ ہر عیسائی لشکر کے ساتھ توپ ساز اور بارود ساز بھی ہوا کرتے تھے جو نہ صرف خراب توپوں کی مرمت کرتے تھے بلکہ ضرورت پڑنے پر میدانِ جنگ ہی میں نئی توپیں بنا بھی سکتے تھے۔ اس بھاری توپ خانے کو سلطنتِ غرناطہ کے جنگلوں سے ڈھکے ہوئے پہاڑی علاقوں تک پہنچانا آسان نہیں تھا۔ اس مقصد کے لیے عیسائی لشکر کے جلو میں مزدوروں اور رضا کاروں کا ایک اور لشکر چلتا تھا جو وسیع علاقے میں جنگلوں کو کاٹتا اور چھوٹی بڑی پہاڑیوں کو ہموار کر کے ہر طرف سڑکوں اور پلوں کا جال بچھاتا جاتا تھا۔ چنانچہ اب لشکروں، توپ خانے اور رسد کی ترسیل بے حد آسان ہوگئی۔

ہم گذشتہ صفحات میں ارونگ کی بیان کردہ حکایت پڑھ چکے ہیں جس میں مسلمان قلعے دار ملکہ ازابیلا کی محاصرہ آرا فوج کو دیکھ کر حقارت سے ہنس پڑا تھا لیکن بی بی مریم نے ازابیلا کو خفیہ راستا دکھلا دیا۔ ضعیف الاعتقاد ہسپانویوں کی لوک داستانیں اپنی جگہ، لیکن سچ یہ ہے کہ یہ ملٹری انجینئرنگ کا معجزہ ہی تھا جس نے عیسائی لشکر پر سارے بند دروزے کھول دیے۔

جب فرڈیننڈ کی فوجوں نے مالقہ کا محاصرہ کیا تو شہر روایتی نقطۂ نظر سے ناقابلِ تسخیر تھا۔ فصیلوں کے برج اونچے تھے، مرکزی قلعہ ایک پہاڑی جبل الفارو کے اوپر بنا ہوا تھا، جہاں سے جارح افواج پر تیروں کی بارش کی جاسکتی تھی اور ان پر ابلا ہوا پانی پھینکا جاسکتا تھا۔ لیکن فرڈیننڈ اپنے ساتھ 'سات بہنیں' لے کر آیا تھا۔ یہ سات بڑے دہانے کی توپیں تھیں جنھوں نے دن رات گولہ باری کر کے جبل الفارو کو راکھ اور دھویں کا ڈھیر بنا دیا۔ شہر کی 'فلک بوس' فصیلوں کے نیچے بارود رکھ کر انھیں اڑا دیا گیا۔ جب فاتح عیسائی افواج نے شہر میں داخل ہو کر تمام مردوں کو غلام اور عورتوں کو کنیزیں بنا کر بیچ دیا تو مالقہ کی عورتیں گلیوں میں چھاتی کوٹتی ہوئی اور یہ بین کرتی ہوئی جاتی تھیں:

او مالقہ! او شہرِ جمیل، او قریۂ معتبر! کہاں گئی تیرے قلعے کی طاقت؟ کہاں ہے تیرے برجوں کی ہیبت؟ کس کام کی تیری یہ چوڑی فصیلیں جو تیرے بچوں کو نہ بچا سکیں؟ اب وہ اجنبی زمینوں پر ایک دوسرے کا ماتم کرتے ہوئے جائیں گے، اور غیر ان کی ہنسی اڑائیں گے۔

کیتھولک ملکہ نے دنیا کی تاریخ میں پہلی بار گشتی جنگی ہسپتالوں کا تجربہ کیا۔ اس کے لشکر کے ساتھ ڈاکٹروں کی ایک ٹیم چلتی تھی جو زخمیوں کا فی الفور علاج کرتی تھی جس کا خرچ خود ملکہ اپنی جیب سے ادا کرتی تھی۔ اسی لیے ازابیلا کو 'ہسپتالوں کی ملکہ' بھی کہا جاتا ہے۔

....

دو جنوری 1492ء

ایک عیسائی عینی شاہد کا آنکھوں دیکھا احوال:

الحمرا کی لال دیواروں پر یسوع مسیح کے مقدس پھریرے لہرا رہے تھے۔۔۔ مسلم سلطان عمدہ لباس زیب تن کیے ستر اسّی شہسواروں کے ہمراہ شاہی جوڑے (فرڈیننڈ اور ازابیلا) کے ہاتھ چومنے نکلا۔ البتہ پسپائی کے معاہدے کے تحت ازابیلا اور فرڈیننڈ ہاتھ چومنے کی پیشکش کو قبول نہیں کریں گے اور غرناطہ کی کنجیاں محمد دوازدہم کے ہاتھوں سے عیسائی ہاتھوں میں منتقل ہو جائیں گی۔ محمد دوازدہم کی بارعب ماں نے اپنے بیٹے کو اس ذلت سے بچانے پر اصرار کرتے ہوئے یہ شق خاص طور پر معاہدے میں شامل کروائی تھی۔ مسلم سلطان کا محبت اور احترام سے خیر مقدم کیا گیا اور اس کا فرزند اس کے حوالے کیا گیا جسے فرڈیننڈ نے یرغمال بنا کر رکھا ہوا تھا۔ پھر چار سو کے قریب قیدیوں کا ایک سنجیدہ اور متین جلوس صلیب اٹھائے، مناجاتیں گاتے ہوئے آیا۔ جب شاہی جوڑے نے اپنے گھوڑوں سے اتر کر صلیب کو تعظیم پیش کی تو تمام حاضرین کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔۔۔ وہاں کوئی ایسا شخص موجود نہیں تھا جس کے گالوں پر آنسو رواں نہ ہوں۔ عیسائی آنکھیں اپنے یسوع مسیح کی ممونیت کے احساس سے نم تھیں، جب کہ سلطان اور اس کے ساتھیوں کی آنکھیں اپنا درد چھپانے سے قاصر تھیں۔ اور کیوں نہ ہوتیں کہ غرناطہ دنیا میں سب سے ممتاز، سب سے بلند مرتبہ تحفہ ہے۔

ابوعبداللہ کی آنکھیں اس کے بعد بھی خشک نہیں ہوئیں۔ وہ تقریب سے سیدھا اپنے

ساتھیوں اور خاندان کے افراد کے ہمراہ غرناطہ سے رخصت ہو گیا۔ جب وہ اس چوٹی تک پہنچا جہاں سے الحمرا کا آخری بار نظارہ کیا جا سکتا تھا تو اس کی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو چھلک پڑے۔ اس کی 'بارعب' ماں عائشہ اس کے ساتھ تھی۔ اس کے منہ سے نکلا:

ابک الیوم بکاء النساء علی ملک لم تحفظ الرجال؟

جس کا دفاع تم مردوں کی طرح نہ کر سکے اس کے لیے عورتوں کی طرح کیوں آنسو بہا رہے ہو؟

اگر یہ روایت درست ہے تو پھر اس موقعے پر سلطانِ گریہ کناں کی ماں کی آنکھوں سے خون کے آنسو رواں ہونے چاہیے تھے کیوں کہ یہ عائشہ ہی تھی جس نے بیٹے کو اپنے خاوند ابوالحسن علی کے خلاف بغاوت پر اکسایا تھا۔

پہاڑی کے اس مقام کو ہسپانوی آج بھی 'مور کی آخری آہ' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

اگر چہ فرڈیننڈ نے کمال فیاضی سے ابوعبداللہ کو غرناطہ کے جنوبی پہاڑوں میں ایک چھوٹی سی جاگیر عطا کر دی تھی، لیکن وہ وہاں رکا نہیں اور سیدھا مراکش چلا گیا۔ وہاں پہنچنے سے پہلے اس نے وہاں کے سلطان کو ایک خط لکھا تھا جسے تاریخ دان المقری نے نقل کیا ہے۔ خط کیا ہے، کس مپرسی کا مرقع ہے جس میں ایک طرف گم گشتہ خوئے سلطانی بھی ملحوظ ہے تو دوسری طرف حریری آستین کے اندر سے دست گدا بھی دراز ہے:

> صاحبِ قشتالیہ (فرڈیننڈ) نے ہمارے لیے ایک پروقار اقامت کا اہتمام کیا ہے اور خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر تحفظ کی ضمانت دی ہے۔ لیکن بنوالاحمر کے جانشین کی حیثیت سے ہم نے اسے قبول نہیں کیا۔ خدا پر ہمارا ایقان ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم کفر کی امان میں رہیں۔ ہمیں اطراف و اکناف سے نیک تمناؤں پر مبنی مراسلے موصول ہوئے ہیں جن میں خوش آئند پیش کشیں کی گئی ہیں۔ لیکن ہم اپنے آبا کے وطن کے علاوہ کسی اور خطے کا انتخاب نہیں کر سکتے۔ ہم صرف اپنے اقربا کی پناہ قبول کر سکتے ہیں۔ مطلب پرستی کے باعث نہیں، بلکہ ہمارے درمیان پائے جانے والے برادرانہ تعلقات کے استحکام کی خاطر، اور اپنے اخلاف کے

عہد ناموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی خاطر، جن میں ہمیں تاکید کی گئی ہے کہ ہم بنومرین کے علاوہ کسی سے اعانت طلب نہ کریں۔ اس لیے ہم طویل زمینی مسافت طے کر کے اور تلاطم خیز سمندروں کو عبور کر آئے ہیں، اس امید پر کہ ہمیں واپس نہیں لوٹایا جائے گا، ہماری آنکھوں کو تشفی دی جائے گی اور ہماری روح پر لگے اس عظیم زخم کو مندمل ہونے کے لیے وقت فراہم کیا جائے گا۔

یہ عرضی رائیگاں نہیں گئی، کیوں کہ المقری نے رقم کیا ہے کہ ابوعبداللہ مراکشی شہر فاس میں مقیم ہو گیا۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ اس کا عظیم زخم مندمل ہوا یا نہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ اس کا خاصی پکی عمر میں، یعنی سقوطِ غرناطہ کے 35 برس بعد انتقال ہوا۔ ایسا لگتا ہے کہ الاحمر خانوادے کے آخری سلطان کو اپنے ساتھ کچھ زیادہ مال وزر لانے کا موقع نہیں مل سکا، کیوں کہ تاریخ دان المقری 1618ء میں اس کے پڑپوتوں سے ملا تھا جن کی گزراوقات ذکوٰۃ وصدقات پر تھی۔

رہے نام اللہ کا۔

پانچ صدیوں بعد اذان

الحمرا سے شمال مغرب کی سمت دیکھیں تو دریائے دارو کے اس پار ایک پہاڑی نظر آتی ہے جو بھورے رنگ کی چھتوں اور سفید دیواروں والے مکانوں سے ڈھکی ہوئی ہے۔ یہ جگہ البائسین کہلاتی ہے۔ اس پہاڑی کے بالکل پیچھے سیکرامونتے کے درجنوں غار ہیں جن میں جپسی رہتے ہیں۔ شام کے بعد یہ غار بقعۂ نور بن جاتے ہیں اور ان کے اندر آمنے سامنے بنچوں پر بیٹھے ہوئے سیاحوں کے ٹولوں کے 'ذوقِ ثقافت' کی تسکین کے لیے رنگ برنگے کپڑے پہنے ہوئے جپسی مرد اور عورتیں فلیمنکو رقص و موسیقی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اشبیلیہ کے فلیمنکو رقص کے مقابلے پر سیکرامونتے کا فلیمنکو زیادہ تیز تھاپ پر کیا جاتا ہے اور اس میں نازکی اور نفاست کی بجائے جوش و جذبہ اور پھرتی زیادہ بھری ہوتی ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ اگر اشبیلیہ کا فلیمنکو غزل گائیکی ہے تو سیکرامونتے کا فلیمنکو فلمی گانا ہے۔

فلیمنکو کی محفلِ رقص و سرود کے اختتام پر راستے میں البائیسین کے سٹاپ پر اتر گیا اور سفری کتاب میں دیے گئے نقشے کی مدد سے پتھریلی گلیوں سے ہوتا ہوا پہاڑی کی چوٹی تک آ گیا۔ یہاں گلیوں کے بیچ میں ایک ہموار میدان سے الحمرا کے پراسرار برج سامنے نظر آ رہے تھے اور ان کے پیچھے سیرا نوادا کی پہاڑیوں کے اوپر چاند اپنی ابدتاب روشنی بکھیر رہا تھا۔

میرے بائیں ہاتھ پر بھورے کھپریل کی مخروطی چھتوں اور سفید دیواروں سے تعمیر شدہ ایک عمارت ہے، جس کا طرزِ تعمیر آس پاس کی دوسری عمارتوں سے اس قدر ملتا جلتا ہے کہ دور سے دیکھنے پر اسے الگ سے پہنچاننا مشکل ہوگا۔ لیکن جو چیز اس عمارت کو اردگرد سے ممتاز بناتی ہے وہ اس کے پچھلے کونے میں ایستادہ تین منزلہ چوکور مینار ہے، جس کے چاروں اطراف دو دو محرابیں بنائی گئی ہیں۔ غور سے دیکھیں تو محرابوں کے اوپر دیوار پر چاروں طرف مربع خطِ کوفی میں کلمہ طیبہ

لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ پانچ سال پہلے بنائی جانے والی مسجدِ غرناطہ ہے۔ اس کی خاص بات یہ ہے کہ یہ نصف ہزار سال میں غرناطہ کی سرزمین پر بنائی جانے والی پہلی مسجد ہے۔

....

آج سے چند عشرے قبل البائیسین کی تنگ گلیاں چوروں اور اچکوں کی آماج گاہیں تھیں۔ دوسرے محلوں کے لوگ یہاں دن کے وقت بھی جانے سے احتراز کرتے تھے۔ لیکن 1983ء میں ایک عجیب واقعہ ہوا جس نے اس علاقے کی تقدیر بدل کر رکھ دی۔ ایک نومسلم خاتون نے، جس کا عیسائی نام انتونیا مینوس فلورس، اور اسلامی نام لیلیٰ تھا، اس مخدوش علاقے کے بیچوں بیچ 'السیرت' کے نام سے ایک قہوہ خانہ کھول لیا جس کی سجاوٹ مورش طرز پر کی گئی تھی۔ غرناطہ کے من بھاتے مشروب کافی اور شراب تھے، وہاں قہوے کا چلن نہیں تھا۔ لیکن اس قہوہ خانے میں عجیب برکت تھی کہ پہلے مراکشی تارکینِ وطن اور شمالی افریقہ کے طلبہ نے ادھر کا رخ کیا، پھر ان کے پیچھے پیچھے مقامی لوگ بھی کھنچے چلے آئے۔ سیاحوں کو غرناطہ میں پرانی مسلم ثقافت کی بڑی طلب تھی، انھیں خبر ہوئی تو وہ بھی گروہ درگروہ آنے لگے اور 'مورش کلچر' کو جرعہ جرعہ نوشِ جاں کرنے لگے۔

دیکھتے ہی دیکھتے السیرت اتنا مقبول ہوا کہ دوسری گلیوں میں بھی اسی طرز کے قہوہ خانے، ڈھابے اور ریستوران کھل گئے۔ پھر ادھر ادھر کچھ دکانوں پر مراکشی دستکاریاں، برتن، الحمرا کے انداز کی ٹائلیں، اور آرائشی اشیا فروخت ہونے لگیں۔ یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر غرناطہ میں آباد مسلمان بھی اس علاقے میں منتقل ہونا شروع ہوگئے۔ پلک جھپکتے ہی علاقے کا نقشہ بدل گیا۔

ان مسلمانوں نے پہاڑی کے عین اوپر ایک غیر آباد گرجا سے ملحق زمین خرید لی، اور وہاں مسجد بنانے کے لیے چندہ اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ جب یہ بات حکام تک پہنچی تو ان میں یوں کھلبلی مچ گئی جیسے کسی نے بھرے کمرے میں سانپ چھوڑ دیا ہو۔ غرناطہ، جہاں آخری مسجد کو پانچ سو سال پہلے مسمار کر دیا گیا تھا، وہاں ایک نئی مسجد کا قیام؟ اور وہ بھی الحمرا کے عین سامنے؟ قدامت پسند ذہنوں کو یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

جدید سپین کے سیکولر معاشرے میں عبادت گاہ تعمیر کرنے پر کوئی قانونی قدغن نہیں لگائی جا سکتی اس لیے بیوروکریسی نے وہ کام کیا جس میں اسے پیدائشی مہارت حاصل ہے۔ انھوں نے اس معاملے کو سرخ فیتے کا کفن پہنانے کی سرتوڑ کوشش کی۔ مسجد کی وجہ سے علاقے کے فنِ تعمیر کی

ہم آہنگی پر اثر پڑے گا، نماز کے لیے آنے والوں کی وجہ سے بھیڑ بھاڑ ہو جایا کرے گی، شور کی وجہ سے محلے کے لوگوں کو تکلیف ہوگی، مسجد کے قریب ہی ایک چرچ ہے، اس کے ساتھ مخاصمت شروع ہو جائے گی، مذہبی منافرت کو ہوا ملے گی، وغیرہ۔

بلدیہ کی طرف سے مسجد کے مجوزہ 45 فٹ اونچے مینار کی اونچائی اور ڈیزائن پر بھی اعتراضات کیے گئے۔ مسلمان یہ معاملہ عدالت میں لے گئے۔ 22 سال تک مقدمہ چلتا رہا، اس دوران مسجد کے نمونے میں دس بار تبدیلیاں کی گئیں، مینار کی بلندی کم کی گئی۔ اسی دوران شہر کی دیواروں پر 'مورو، گھر جاؤ' کے نعرے نمودار ہو گئے۔ مقدمہ چلتا رہا۔

آخر وہ لمحہ آ گیا جب مسجد کی تعمیر روکنے کے لیے تمام حربے ناکام ہو گئے، اور دس جولائی 2003ء کو بروزِ جمعرات ایک چھوٹی سی تقریب میں مؤذن نے مسجد کے مینار پر چڑھ کر اذان دی۔ یہ غرناطہ کی پہاڑیوں میں پچھلے پانچ سو سالوں میں گونجنے والی پہلی صدائے اذاں تھی۔

مسجد کھلنے کے فوراً بعد ملحقہ چرچ بھی یکا یک آباد ہو گیا جو پچھلے تیس سال سے ویران پڑا تھا۔ اب وہاں اتوار کے اتوار باقاعدگی سے سروس ہوتی ہے۔

....

اگلے دن البائسین میں ایک چھوٹی سی گلی کے اندر میں نے مشرقی طرز کے قالین اور آرائشی چیزیں دیکھیں تو اس کے اندر چلا گیا۔ جگہ جگہ قہوہ خانے، مراکشی ریستوران، ہر طرف سے کانوں میں پڑتی ہوئی عربی زبان۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں یکا یک آبنائے جبرالٹر پھلانگ کر مراکش پہنچ گیا ہوں۔ یہیں ایک دکان میں مراکشی نوجوان دکان دار حمزہ سے ملاقات ہوئی جو دن میں غرناطہ یونیورسٹی میں بزنس کی تعلیم حاصل کرتا ہے اور شام کو پڑھائی کا خرچ پورا کرنے کے لیے دکان پر بیٹھتا ہے۔ حمزہ نے بتایا کہ سپین میں اسلام کا احیا ہو رہا ہے۔ نہ صرف لاکھوں مسلمان شمالی افریقی ملکوں سے آ کر یہاں آباد ہو رہے ہیں بلکہ مقامی عیسائی بھی بڑی تعداد میں اسلام قبول کر رہے ہیں۔ اس نے اطلاع دی کہ سپین میں اس وقت دس لاکھ سے زائد مسلمان موجود ہیں جب کہ حالیہ برسوں میں بیس سے لے کر پچیس ہزار ہسپانوی عیسائیوں نے اسلام قبول کیا ہے۔

شہر جو ترجمہ بن گیا

میرا نام مائیکل سکاٹ ہے۔ آپ کو نام ہی سے اندازہ ہو گیا ہوگا، میری پیدائش سکاٹستان کی ہے، لیکن تعلیم کی غرض سے میں بچپن ہی میں شمالی انگلستان کے شہر ڈرہم چلا آیا تھا جو سکاٹستان کی سرحد سے زیادہ دور نہیں۔ میرا ارادہ بڑے ہو کر پادری بننے کا تھا، کیوں کہ معاشرے میں پادری سے بڑھ کر کسی کی عزت نہیں تھی۔

ڈرہم میں ایک عظیم الشان کلیسا ہے۔ میں اکثر اس کلیسا میں جایا کرتا تھا۔ ناف کلیسا کا محراب دار ہال خاص طور پر جاذبِ توجہ تھا، اور میں اتوار کے روز وعظ کے بعد وہاں دیر تک کھڑا ہو کر محرابوں کو تکتا رہتا تھا جو سنگی ستونوں سے قوسِ قزح کی طرح پھوٹ کر ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتی تھیں۔ کلیسا کی رنگ دار کھڑکیوں سے چھن کر اندر آنے والی روشنی کی وجہ سے دن بھر ان قوسوں کے رنگ بدلتے رہتے تھے۔ ایک روز کسی نے مجھے بتایا کہ یہ محرابیں عربی طرز پر بنائی گئی ہیں۔ عرب کون؟ جس سے پوچھا، اس نے مختلف جواب دیا۔ پھر معلوم ہوا کہ بلادِ یورپ کے جنوب میں اندلس نامی کوئی ملک ہے، جس پر عرب حکمران ہیں، اور کلیسا کا یہ حصہ اس ملک کے شہر قرطبہ میں واقع بڑی مسجد کی محرابوں سے متاثر ہو کر تعمیر کیا گیا ہے۔

کچھ ہی عرصے مجھے لاطینی زبان کی ایک کتاب 'پادریانہ علوم' دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ کتاب کا مصنف پطرس الفونسی تھا۔ اس کتاب نے مجھے ایک پراسرار جہان میں پہنچا دیا۔ کتاب کا انداز داستان در داستان کا تھا اور اس میں دل چسپ قصے کہانیوں کی مدد سے مفید اخلاقی نکتے سجھائے گئے تھے۔ سندباد جہازی، لومڑی اور خچر، آدمی اور سانپ، شاعر اور کبڑا، اور بادشاہ اور قصہ گو ایسی کہانیاں ہیں جو مجھے آج بھی یاد ہیں۔ ان میں سے اکثر کہانیاں ایک عرب کی زبانی بیان کی گئی ہیں جو اپنے بیٹے اور شاگرد کو نصیحت کی خاطر یہ کہانیاں سناتا ہے۔ بہت بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ

الفانسو نے اس کتاب کے لیے عربی داستانوں، خاص طور پر مشہور داستان در داستان الف لیلہ سے استفادہ کیا تھا۔

پطرس الفونسی ہمارے ہی ملک کے شہر لندن میں رہتا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ دراصل اندلس کا باشندہ ہے اور وہاں سے دنیا کے جدید ترین علوم سیکھ کر آیا ہے، فلکیات، ریاضی، طب، فلسفہ۔ ہمارے ملک میں ان علوم کی تعلیم دی جاتی تھی، لیکن بہت واجبی سی۔ میں نے چند سال کے اندر اندر ہی جتنا کچھ انگلستان میں سیکھا جا سکتا تھا، سیکھ لیا۔ لیکن میرے اندر کی پیاس تھی کہ بڑھتی چلی گئی۔

....

اب بس طلیطلہ (طولیدو) کی جانب عازمِ سفر تھی، جو میڈرڈ میں سفر کے اختتام سے پہلے آخری سٹاپ تھا۔ غرناطہ سے طلیطلہ کا فاصلہ تین سو کلومیٹر کے لگ بھگ ہے، جو موٹر وے پر تقریباً چار گھنٹے میں طے ہوا۔ اس سفر میں ہمارے رہبر البرتو تھے۔ یہ ریٹائرڈ بس ڈرائیور تھے اور اب دل بہلانے کی خاطر انھوں نے رہبری کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ عمر ساٹھ سے متجاوز، اندر کو دھنسی ہوئی نیلی آنکھیں، لمبا قد، کمر فوجیوں کی مانند سیدھی، سرخ تمتمایا ہوا چہرہ جیسے کسی بڑی مہم پر نکلے ہوئے ہیں، گردن پر جھریوں اور سبز رگوں کا جال، آواز کرخت و بلند۔

ان کے بارے میں ڈان ہوان نے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ یہ بہت تیز اور نان سٹاپ بولتے ہیں۔ انھوں نے گاڑی میں گھستے ہی کہہ دیا، 'بھئی میرے بارے میں تو بہت شکایتیں آتی ہیں کہ میں بہت تیز بولتا ہوں، لیکن کیا کروں، دانستہ طور پر آہستہ بولنا شروع کرتا ہوں لیکن خود بخود رفتار تیز ہوتی جاتی ہے کہ یہ ہماری خاندانی بیماری ہے۔ شکر کریں آپ میری خالہ سے نہیں ملے، ان کی اکثر باتیں تو میرے بھی سر کے اوپر سے گزر جاتی ہیں۔ لیکن خیر آپ فکر نہ کریں، اگر کوئی بات سمجھنے میں دشواری ہو تو فوراً ٹوک دیا کریں، میں بریک پر پاؤں رکھ دیا کروں گا۔'

البرتو صاحب نے نسبتاً آہستگی سے آغاز کیا، لیکن ابھی ہماری بس شہری حدود سے نکل کر موٹر وے تک نہیں پہنچی تھی کہ البرتو صاحب اس سے پہلے ہی پوری رفتار سے رواں ہو چکے تھے۔ ہمارے مستقل گائیڈ ڈان ہوان پچھلی سیٹ پر آنکھیں موندے نیم دراز تھے۔ انھوں نے وہیں لیٹے لیٹے ہسپانوی میں ہشکارا تو بارے البرتو نے بریک پر پاؤں رکھا۔ لیکن بے سود۔ پانچ منٹ بعد بعد

پھر وہی چال تھی۔

لیکن خیر یہ ماننا پڑے گا کہ موصوف کی معلومات کی کوئی حد نہیں تھی، اور اوپر سے حسِ مزاح بھی خوب کراری اور کاٹ دار۔ ہر موڑ، ہر کونے، ہر چوٹی کے بارے میں ان کے پاس کوئی تاریخی واقعہ، کوئی ولولہ انگیز معرکہ، یا کوئی بھڑکیلا چٹکلا ضرور موجود تھا۔ اور کچھ نہیں تو اپنے خلاف ہی کوئی لطیفہ سنا کر بس کو قہقہہ زار بنا دیتے تھے۔

....

ڈرہم کے کلیسا کی محرابیں اور پطرس الفونسی کی کتاب۔ میرے دل میں اندلس کی پراسرار سرزمین کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا جو رفتہ رفتہ جنون کی حد تک پہنچ گیا۔ لیکن مجھے بتایا جاتا تھا کہ مسلمان عیسائیوں کے جانی دشمن ہیں۔ ان کے بادشاہ صلاح الدین ایوبی نے ابھی حال ہی میں عیسائیوں کے مقدس ترین مقام اور یسوع مسیح کی جائے پیدائش یروشلم پر دوبارہ قبضہ کر لیا ہے جسے صلیبی مجاہدوں نے سو سال قبل آزاد کرا لیا تھا۔ ان حالات میں ایک عیسائی کے لیے کسی مسلم ملک میں جانا خودکشی کے مترادف تھا۔ جب میری عمر سولہ برس کی ہوئی تو میں نے ڈرہم اور اس کے گرد و نواح میں دستیاب تمام کتابیں حفظ کر ڈالی تھیں، لیکن انھوں نے میرے دل و دماغ پر وہی اثر کیا جو جلتی ہوئی آگ پر چھڑکے جانے والا تیل کرتا ہے۔ میں گھر چھوڑ کر جنوب کی سمت روانہ ہو گیا۔ کئی ہفتوں کے سفر کے بعد میں آکسفرڈ نامی مقام پر پہنچا اور وہاں کے بڑے مدرسے میں داخلہ لے لیا۔ لیکن یہاں چند ہی ماہ گزرے تھے کہ مجھے محسوس ہوا کہ میرے اندر علم کی پیاس آکسفرڈ سے نہیں بجھے گی، چناں چہ میں پادریوں کے ایک ٹولے کے ساتھ فرنگی شہر پیرس جا پہنچا۔

اس زمانے میں پیرس زبردست تبدیلی کے دور سے گزر رہا تھا۔ کچھ ہی عرصہ پہلے فلپ ثانی نے اسے اور لینز کی جگہ ملک کا دارالحکومت منتخب کیا تھا جس کی وجہ سے شہر کی آبادی میں دیکھتے ہی دیکھتے کئی گنا کا اضافہ ہو گیا تھا۔ ہر طرف تعمیرات ہو رہی تھیں، شہر کے گرد بڑی فصیل بن رہی تھی جب کہ نوٹرے ڈیم کے مشہور کلیسا کی دیواریں میرے پیرس میں قیام کے دوران اٹھائی جا رہی تھیں۔ پیرس کے تنگ اور پرشور بازاروں میں ریچھ کی کھال اوڑھے شمالی بلاد کے وحشیوں کے ساتھ ساتھ بے عیب سیاہ منقش عبائیں اوڑھے ہوئے پادری بھی دکھائی دیتے تھے۔ کیچڑ سے سنی سڑکوں پر نوابوں کی سجی سجائی عالی شان بگھیاں کسانوں کی چوں چوں کرتی بے ڈھنگے پہیوں والی

بیل گاڑیوں کے پہلو بہ پہلو گزرتی تھی۔ اس وقت پیرس آبادی اور معیشت کے لحاظ سے لاطینی یورپ کا سب سے بڑا شہر تھا۔

عیسائی دنیا میں تمام تر تعلیم کلیسا کے ذریعے ہوا کرتی تھی۔ کلیسا کے پادریوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ دینی اور دنیاوی دونوں اقسام کے علوم میں مہارت بہم پہنچائیں۔ اس لیے ہر بڑے کلیسا کے ساتھ مدرسے ملحق ہوا کرتے تھے جن میں راہب تعلیم دیا کرتے تھے۔ یونیورسٹی آف پیرس ان دنوں طفولیت کے دور سے گزر رہی تھی، اور ارد گرد کی ریاستوں سے طالب علموں کی بڑی تعداد حصولِ علم کے لیے یہاں آیا کرتی تھی۔ پیرس کی مرکزی دانش گاہ خاص طور پر ریاضی کی تعلیم کے لیے بلادِ یورپ کے طول و عرض میں مشہور تھی۔

یہاں جماعتوں کے کمروں میں فرش پر پیال بچھی ہوتی تھی، جن پر طلبہ براجمان ہوتے تھے، جب کہ اساتذہ طلبہ کے درمیان گھوم پھر کر پڑھایا کرتے تھے۔ پیرس کا موسم میرے وطن کی نسبت بہت اچھا تھا، دور دور تک کھلا نیلا آسمان اور اس کے اندر رنگ برنگ تیرتے بادلوں کے پرے دل کو بہت بھاتے تھے۔ لیکن سردیوں میں پیال کا فرش تکلیف دہ بن جایا کرتا تھا۔ پیال کی باریک تہہ برف کی سل جیسے یخ فرش کی سردی کو تادیر روکنے سے قاصر رہتی اور جماعت کے اختتام تک کولہے برف ہو جاتے تھے۔

میں نے پیرس میں دو برس گزارے۔ اس دوران نہ صرف دینیات کی اعلیٰ سند حاصل کی بلکہ دانش گاہ کے ماحول سے فائدہ اٹھا کر علمِ ریاضی پر اس قدر دسترس حاصل کر لی کہ جلد ہی مجھے 'مائیکل ریاضی دان' کے نام سے پکارا جانے لگا۔

اسی دوران مجھے غیر متوقع طور پر جزیرۂ سسلی کے نوعمر سلطان فریڈرک ثانی کی اتالیقی کی پیش کش کی گئی۔ کسی شاہی دربار سے وابستگی، اور اس سے بڑھ کر ایک نئی سرزمین دیکھنے کی خواہش میرے لیے بہت کشش رکھتی تھی۔ اس لیے ایک صبح منھ اندھیرے میں نے کسی کو بتائے بغیر اپنا مختصر سامان بغل میں دبایا اور روم جانے والے ایک قافلے کے ہم رکاب ہو گیا۔

....

طلیطلہ شروع ہونے سے بہت پہلے ہی پہاڑی پر بنے ہوئے مرکزی کلیسا کے چار مینار دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اصل شہر دریائے ٹیگس کی آغوش میں لپٹا ہوا پہاڑی کے اوپر آباد ہے۔

یہاں سے صحیح اندازہ ہوتا ہے کہ اس شہر کی اتنی تاریخی اہمیت کیوں رہی ہے۔ دریا شہر کو تین طرف سے قدرتی پناہ فراہم کرتا ہے، چوتھی طرف چٹانیں ہیں، جن کے درمیان ان سے بھی بلند فصیلیں اور برج تعمیر کیے گئے ہیں۔ اس لیے زمانۂ قدیم میں اس شہر کو کھلی فوج کشی کے ذریعے تسخیر کرنا قریب قریب ناممکن تھا۔ جارح افواج زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتی تھیں کہ شہر کا محاصرہ کر لیتیں اور پھر مہینوں آس لگا کر بیٹھ جاتیں کہ شہریوں کا راشن ختم ہو جائے اور وہ شہر کے دروازے کھولنے پر مجبور ہو جائیں۔ لیکن اکثر یہ ہوتا تھا کہ خود محاصرہ کرنے والی افواج کی رسد اور اس سے بھی پہلے حوصلہ ختم ہو جاتے اور وہ منھ لٹکائے واپس چلے جاتے۔ ان دفاعی وجوہات، اور سپین کے عین وسط میں واقع ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کی آمد سے قبل یہ شہر ہسپانیہ کے وزی گوتھ حکمرانوں کا دارالحکومت تھا اور طارق بن زیاد سے شکست کھانے والا راڈرک اسی شہر سے اٹھ کر بربر جرنیل کا مقابلہ کرنے گیا تھا۔ مسلمانوں نے 711ء طلیطلہ پر لڑے بغیر قبضہ کر لیا، تاہم آنے والی صدیوں میں یہ شہر کئی بار قرطبہ کی مرکزی حکومتوں کے خلاف بغاوتوں کا گڑھ بنا رہا۔ یہ الگ بات کہ ان بغاوتوں کا اہتمام عیسائی نہیں بلکہ سرکش مسلمان سردار کیا کرتے تھے۔

ہم جب شہر کے قریب پہنچے تو جگہ جگہ گرجاؤں کے کلس دوپہر کی دھوپ میں چمک رہے تھے۔ دریا کے اوپر شہر جانے کے لیے پل تھا لیکن ہماری بس پہلو بچا کر شہر کے بالمقابل دریا کے مغرب میں ایک اور پہاڑی پر بل کھاتے ہوئے چڑھنے لگی۔ ڈان ہوان کی نیند پوری ہو چکی تھی۔ انھوں نے انگڑائیاں لیتے ہوئے اعلان کیا کہ اول طعام بعد کلام۔ یعنی پہلے لنچ تناول کیا جائے گا پھر تفصیل سے شہر کی سیر کی جائے گی۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے زبردست لوکیشن کا انتخاب کیا تھا۔ پہاڑی کی چوٹی پر بنائے گئے ریستوران کے سامنے طلیطلہ کاغذ پر بنے ہوئے نقشے کی مانند بکھرا ہوا تھا۔

ڈان ہوان صاحب پکارتے رہے لیکن میں اور کئی دوسرے ساتھی بس سے کود کر ریستوران کے اندر جانے کی بجائے سڑک کے کنارے جنگلے کے پیچھے کھڑے ہو کر، اپنا کیمرا کسی اور کو تھما کر، اور پوز بنا بنا کر کھٹا کھٹ شہر کی تصاویر کھینچنے اور کھنچوانے لگے۔ پہاڑی پر واقع ہونے کی وجہ سے طلیطلہ میں زمین کی قلت ہے، اس لیے گھر بہت قریب قریب بنائے گئے ہیں۔ بلکہ دور سے دیکھنے پر طلیطلہ کے گھر ایک دوسرے سے ٹیک لگائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے کونے

کے گھر کو قطار میں سے نکال دیا جائے تو باقی سب بھی دھڑام سے زمین پر آ رہیں گے۔

....

پالیرمو کے شاہی دربار میں جا کر میں بھونچکا رہ گیا۔ کہاں یخ بستہ کہرے سے ڈھکی ہوئی سرزمینِ سکاٹستان کا ایک دیہاتی باسی اور کہاں محلاتِ سلاطین کی آن بان۔ عرب محل، اس کا پائیں باغ اور اس میں رواں نہریں، محل کا چالیس ستونوں والا عظیم ہال، جس کی دیواروں پر عرب فن کاروں نے وہ نقاشی کی ہے جو صرف انھی کا خاصا ہے۔ آنکھوں کو طراوت بخشنے والے سبزہ زار، اور جگہ جگہ فضا میں قوسِ قزح بکھیرتے ہوئے فوارے۔ یہ محلات عربوں نے سسلی پر اپنے دوسوسالہ اقتدار کے دوران تعمیر کیے ہیں۔

پیرس کے برعکس پالیرمو کی گلیاں چوڑی اور سڑکیں کشادہ ہیں۔ عمارتیں چونے کے پتھر سے تعمیر کی گئی ہیں۔ شہر کے بیچوں بیچ نہر بہتی ہے جس کے اندر سے چار چشمے پھوٹ کر پورے شہر کو سیراب کرتے ہیں۔

میں نے دیکھا کہ پالیرمو میں ہزاروں عربی دان موجود ہیں۔ خود شہنشاہ فریڈرک عربی جانتے ہیں۔ شاہ نہ صرف علم کے قدردان ہیں بلکہ انھوں نے مضطرب و متجسس دماغ پایا ہے، اور وہ امورِ ریاست میں سے وقت نکال کر طرح طرح کے سائنسی تجربات کرتے رہتے ہیں۔ آگے چل کر انھوں نے علمِ عقابیات پر ایک کتاب تحریر کی جو ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔

میں نے پالیرمو میں موقع غنیمت سمجھ کر عربی زبان میں شدبد پیدا کر لی، تاکہ اس زبان میں مقید علم کے ذخیرے تک رسائی حاصل کی جا سکے۔ اس دوران معلوم ہوا کہ اندلس کے کچھ حصے عربوں کے قبضے سے چھڑا لیے گئے ہیں۔ لوگ خاص طور پر اندلس کے ایک شہر طلیطلہ کا ذکر کرتے تھے جہاں آرچ بشپ ڈان ریمون نے ایک دارالترجمہ قائم کیا تھا۔ اس عظیم الشان ادارے سے کئی عرب اور یہودی دانش ور وابستہ تھے اور وہاں دنیا کے تمام موضوعات پر عربی کتابوں کے بیش بہا ذخیرے کو لاطینی زبان میں منتقل کرنے میں سرگرم تھے۔ پالیرمو کے شاہی محل میں میری زندگی بہت سکھ چین سے گزر رہی تھی، لیکن میرے دل میں وہ کسک پیدا ہو گئی تھی جو اندلس جائے بغیر ختم نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ ایک دن بادشاہ کی آشیرباد سے میں دریائے ٹیگس پر آباد طلیطلہ جا پہنچا۔

....

کھانے کے بعد بس مڑی اور واپس پل کی طرف روانہ ہوگئی۔ یہ تاریخی پل الکنتارا کہلاتا ہے جہاں کئی یادگار معرکے بپا ہوئے۔

1085ء میں پونے چار صدیوں کے تسلط کے بعد طلیطلہ کے مسلمان حکمران نے شہر کی کنجیاں گویا طلائی طشتری میں رکھ کر الفانسو ششم کو تھما دیں۔ یہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلنے والا اندلس کا پہلا بڑا شہر تھا۔ سقوطِ طلیطلہ سے کوئی نصف صدی قبل اندلس میں اموی خلافت کا چراغ گل ہونے کے بعد تمام ملک چھوٹی بڑی، ایک دوسرے سے جوتم پیزار، ریاستوں، یا طائفوں میں بٹ گیا تھا۔ ان میں سے ایک اہم طائفہ طلیطلہ کا تھا، جس نے امیر یحیٰی ابنِ المامون کی حکمرانی میں اتنی ترقی کی کہ قرطبۂ ثانی کہلانے لگا۔ ابن المامون کے عزائم بہت بلند تھے۔ وہ نہ صرف سارے اندلس پر حکمرانی چاہتا تھا، بلکہ قرطبہ کی لٹی ہوئی عظمت کو طلیطلہ میں بحال کرنا چاہتا تھا۔ اس دوران اشبیلیہ کے طاقت ور طائفے میں عبادید خاندان کے شاعر بادشاہ معتمد کی حکومت تھی جو خود اندلس بھر پر اپنا پرچم لہرانے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ چناں چہ ان دونوں طائفوں میں ٹھن گئی۔ پہلے المامون نے قرطبہ فتح کیا، لیکن جلد ہی اسے معتمد کی فوجوں نے شکست دے کر قرطبہ اس کے ہاتھوں سے چھین لیا۔ جب تک ابنِ مامون زندہ رہا، یہ دونوں طائفے مسلسل دست و گریبان رہے۔

دونوں طائفوں کے درمیان یہ جنگ صرف تیر و تلوار ہی سے نہیں لڑی گئی، بلکہ دونوں نے ایک دوسرے سے ثقافتی، فنی، علمی، اور ادبی میدانوں میں آگے نکلنے میں بھی اتنی ہی تندہی کا مظاہرہ کیا۔ اگر ایک طرف معتمد کا دربار شاعروں، ادیبوں اور فن کاروں کا مرجع تھا تو المامون نے طلیطلہ کو فلسفیوں، دانش وروں، فن کاروں، اور سب سے بڑھ کر کتب خانوں سے مالا مال کر دیا۔ اس کی علم دوستی کی ایک دلیل یہ ہے کہ اس نے مشہور اندلسی ماہرِ ادویا ابن الوافد کو اپنا وزیر مقرر کیا تھا۔ ابن الوافد کی میٹیر یا میڈیکا 'کتاب الادویہ المفردہ' کا لاطینی ترجمہ یورپ بھر کی جامعات میں صدیوں تک بنیادی نصاب کے طور پر پڑھایا جاتا رہا۔

المامون کے باغات بھی مشہور ہیں۔ خاص طور پر اس کا 'بوستان الناعورہ' (جل پہیے، یا واٹر وِیل کا باغ) یورپ کا سب سے پہلا بوٹینیکل گارڈن ہے جس میں دور دراز کے ملکوں، حتیٰ کہ مشرقِ وسطیٰ تک سے انواع واقسام کے پودے جمع کر کے لگائے گئے تھے، اوران پر تجربات کیے

جاتے تھے۔ المامون کی سرپرستی میں پروان چڑھنے والا ایک اور نام ماہرِ فلکیات ابواسحٰق الزرقالی کا ہے، جس کے بنائے گئے فلکیات کے جدول (Tables Toledan) اپنے زمانے میں حرفِ آخر کا درجہ رکھتے تھے۔ الزرقالی کے رسوخ اور مغربی دنیا میں اس کی وقعت کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ اس کے مرنے کے ساڑھے تین سو سال بعد جرمنی میں اس کی کتاب کی شرح لکھی گئی۔ اور تو اور، سورج کو نظامِ شمسی کا مرکز ثابت کرنے والے ماہرِ فلکیات کوپرنیکس نے اپنی شہرہ آفاق کتاب 'حرکاتِ اجرامِ فلکی' میں الزرقالی کا حوالہ دیا ہے۔ جدید فلکیات نے الزرقالی کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے چاند کے ایک گڑھے کا نام اس کے نام پر رکھا ہے۔

لیکن جیسا کہ تاریخ میں اس سے پہلے اور بعد میں ہوتا آیا ہے، طاقت ور بادشاہ کے مرنے کے بعد اس کا تخت بہت پھسلواں ثابت ہوتا ہے۔ چناں چہ ابن المامون کی ناخلف اولاد سے حکومت نہ چلائی جا سکی، حتیٰ کہ 1085ء میں المامون کے بیٹے القادر نے جان کی امان کے بدلے طلیطلہ قشتالیہ کے بادشاہ الفانسو ششم کو تھما دیا۔ یہ سپین میں مسلم اقتدار کے خلاف عیسائی استرداد کی پہلی بڑی کامیابی تھی۔ اگلے برس اسی الفانسو کو یوسف بن تاشفین نے جنگِ زلاقہ میں عبرت ناک شکست دی لیکن الفانسو میدانِ جنگ سے بھاگ کر طلیطلہ میں قلعہ بند ہو گیا اور یوسف واپس مراکش چلا گیا۔

جب طلیطلہ پر عیسائی افواج کا قبضہ ہوا تو یورپ بھر کے عیسائیوں کے لیے بھی پہلے بڑے مسلم شہر کے دروازے کھل گئے۔ اسی شہر میں سب سے پہلے ان کا آمنا سامنا اس عظیم الشان علمی ورثے سے ہوا تھا جو مسلمانوں نے پچھلے تین سو سالوں میں خشت خشت تعمیر کر رکھا تھا۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ طلیطلہ نے ہندوستان سے لے کر اندلس تک پھیلی ہوئی مسلم دنیا اور عیسائی یورپ کے درمیان پل کا کردار ادا کیا۔

بارھویں صدی تک یورپ بھر میں لوگ یونانی حکما و فلاسفہ کو بھلا چکے تھے۔ ان زعما کی فلکیات، طب، جغرافیہ، فلسفہ، اور دوسرے علوم پر لکھی گئی کتابیں یورپ کی کسی زبان میں دستیاب نہیں تھیں۔ لیکن مسلمان پچھلے تین سو سال سے نہ صرف یہ بیش بہا کتابیں عربی میں منتقل کرنے میں منہمک تھے، بلکہ انھوں نے دوسری تہذیبوں کا کام بھی عربی میں ترجمہ کر رکھا تھا اور ان علوم میں خود بھی خاصہ اضافہ کیا تھا۔ یوں سمجھیے کہ اس وقت عربی زبان وہ صندوق تھا جس

میں دنیا بھر کے علوم وفنون کی کلید بند تھی۔ یہ صورتِ حال کلیسا کے لیے بہت تشویش کا باعث تھی، کیوں کہ کلیسا خود کو علم کا پاسبان سمجھتا تھا۔ چنانچہ کلیسا نے بہت رقم خرچ کر کے اپنی نگرانی میں عربی سے لاطینی زبان میں کتابیں ترجمہ کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اس مہم میں طلیطلہ نے ہراول دستے کا کام سرانجام دیا۔

....

جب میں طلیطلہ میں وارد ہوا تو سال 1210ء ختم ہونے کے قریب تھا۔ یہاں کے انداز و ادا نرالے تھے۔ ترجمے کے کاروبار نے یہاں صنعت کی حیثیت اختیار کر لی تھی جسے کلیسا اور ریاست دونوں کی بھرپور سرپرستی حاصل تھی۔ شہر کی اونچی نیچی گلیوں میں جگہ جگہ کتب خانے، کتابوں کی دکانیں، اور دارالتراجم قائم تھے۔

طلیطلہ کے مرکزی ترجمہ خانے میں طریقۂ کار کچھ یوں تھا کہ عربی داں مسلمان یا یہودی عربی کتاب کا ایک صفحہ پڑھ کر اسے مقامی ہسپانوی زبان میں ایک مصنف کو سناتے جو اسے لاطینی میں منتقل کر دیتا۔ بعد میں ایک تجربہ کار مدیر اس دن ترجمہ کیے جانے والے اوراق کا جائزہ لیتا اور اپنی تسلی کے بعد اس پر مہرِ تصدیق ثبت کر دیتا۔ جب میں طلیطلہ کے بشپ سے ملا تو وہ میرا کام، عربی سے واقفیت، اور لاطینی زبان پر مہارت دیکھ کر خاصے متاثر ہوئے اور انھوں نے مجھے ارسطو کی ایک کتاب عربی سے لاطینی میں ترجمہ کرنے کے لیے سونپ دی۔ میرے حصے میں دو یہودی عربی دان نائب مترجمین آئے۔ ابوداؤد اور آندرے الفقیر۔ ہم نے دن رات ایک کر کتاب کو لاطینی میں منتقل کرنے کا کام شروع کر دیا۔ بہت جلد ہمارے درمیان اچھا پیشہ ورانہ تعلق قائم ہو گیا، اور ہم نے دوسروں کی نسبت کہیں کم وقت میں کتاب ختم کر ڈالی۔ مجھے احساس ہوا کہ اب تک میری ساری زندگی دراصل اسی کام کی تیاری تھی، ڈرہم، آکسفرڈ، پیرس، پالیرمو، یہ سب میری اصل کتابِ زندگی کا پیش لفظ تھے۔ بشپ نے کتاب کی سلاست کی خاص طور پر داد دی، اور کمال سخاوت سے مجھے مقررہ معاوضے سے ڈیڑھ گنا زیادہ رقم عطا کی۔

لیکن مجھے احساس تھا کہ دو زبانوں میں ترجمے کی وجہ سے دوری بڑھ جاتی ہے۔ عربی تھوڑی بہت تو مجھے پہلے ہی آتی تھی، اس دوران میں اردگرد کے ماحول سے فائدہ اٹھا کر استعداد بڑھانے کی کوشش کی، تاکہ لاطینی ترجمے کو اصل کے قریب تر رکھا جا سکے۔ میری اگلی مہم ابنِ سینا کی علم

الحیوانات پر کتاب کو لاطینی میں منتقل کرنا تھا۔ اس بار زیادہ مشکل پیش نہیں آئی۔

....

المامون کی اولاد تو نکمی نکلی، لیکن 'پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے' کے مصداق الفانسو ششم اور اس کے جانشین ابن المامون کے اصل وارث ثابت ہوئے جنھوں نے طلیطلہ کی علمی سرگرمیوں کی پہلے سے بھی بڑھ کر سرپرستی کی۔ الفانسو ششم گو کہ ساری زندگی مسلمان طائفوں سے برسرِ پیکار رہا لیکن اس نے اپنی سلطنت میں مسلمانوں اور یہودیوں کو بھرپور آزادی دی۔ کچھ ہی عرصے میں طلیطلہ میں المامون کے دور کی طرح کا علمی ماحول قائم ہو گیا، جہاں نہ صرف شمالی عیسائی، بلکہ بنیاد پرست مسلمان ریاستوں کے ستائے ہوئے مسلمان اور یہودی بھی آ آ کر آباد ہونے لگے۔ بہت جلد بغداد میں تین صدیاں قبل قائم ہونے والے دارالحکمہ کی طرز پر طلیطلہ میں بھی سرکاری دارالتراجم قائم ہو گیا، جہاں مائیکل سکاٹ کے علاوہ سینکڑوں دوسرے مترجمین سرگرمِ کار تھے۔ انھی مترجمین نے ارسطو، افلاطون، بطلیموس، بقراط، جالینوس، اقلیدس، ارشمیدس جیسے یونانی حکما کے علاوہ مسلمان علما خوارزمی، ابنِ سینا، ابنِ رشد، الکندی، الفغانی، الزرقالی، ابنِ نفیس، ابنِ طفیل، الرازی، الغزالی، الفارابی، حنین بن اسحٰق، ثابت ابن قرہ، الزہراوی، وغیرہ کا لاطینی میں ترجمہ کیا۔ اسی طلیطلہ کی بدولت یورپ اعلیٰ جیومیٹری، جدید جغرافیہ، علمِ کیمیا اور الجبرا سے روشناس ہوا۔ یہی وہ تراجم تھے جنھوں نے صدیوں سے تاریکی میں ڈوبے ہوئے یورپ میں علم کی نئی جوت جلا دی۔ اس کے لیے یورپ کو دریائے ٹیگس سے بغل گیر اس شہر کا احسان مند ہونا پڑے گا کیوں کہ اسی نے یورپ میں نشاۃ الثانیہ کے بیج بوئے جنھوں نے یورپ کو صحیح معنوں میں یورپ بنایا۔

....

بارہویں اور تیرہویں صدی کے طلیطلہ نے نہ صرف یورپ کو مسلم تہذیب کی ترسیل کا فریضہ سرانجام دیا بلکہ ایک لحاظ سے یہ شہر خود ہی ترجمہ بن گیا تھا۔ اس 'ترجمے' کی ایک درخشاں مثال طلیطلہ کی پہاڑی کے اوپر بنا ہوا سان رومان کا مشہور چرچ ہے جس کے اندر اندلس کی 'گنگا جمنی' تہذیب اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ آج کل اس چرچ کو وزی گاتھک کلچرل میوزیم بنا دیا گیا ہے۔ بیرونی دیوار کی محرابوں کے سفید و سرخ اینٹوں والے ڈیزائن میں قرطبہ کی عظیم مسجد کی بازگشت

صاف سنائی دیتی ہے۔ چرچ کا مربع مینار اپنی تعمیر اور سجاوٹ میں کسی مسجد کا مینار معلوم ہوتا ہے۔ چرچ کے اندر جا کر دیکھا تو اس کے ستون اور دیواریں اندلسی انداز میں منقش نظر آئیں، البتہ دیواروں پر عیسائی روایت کے مطابق مقدس واقعات کی تصاویر بنائی گئی ہیں۔ لیکن یہاں جو چیز سب سے حیران کن ہے وہ محرابوں کے گرد موجود خوش نما عربی خطاطی ہے۔ یہ چرچ اس وقت بنا تھا جب اندلس کے بیشتر حصے پر عیسائی سکہ جاری ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود سان رومان کے اس چرچ کے اندر خطِ اندلسی میں عربی خطاطی اس بات کی غماز ہے کہ فاتحین مسلم کلچر سے مفتوح ہو گئے۔

مسلمانوں کو شکست دینے کے بعد عیسائی حکمرانوں نے طلیطلہ کو تمام سپین کا دارالحکومت بنا دیا لیکن جب شہر کی آبادی بڑھنے لگی اور شہر کے جغرافیے نے مزید پھیلاؤ کی اجازت نہ دی تو انھوں نے بوریا بستر باندھا اور پایۂ تخت کشادہ میڈرڈ منتقل کر دیا، جس سے طلیطلہ گمنامی میں اٹ گیا۔ یہ کم بختی طلیطلہ کے لیے دراصل خوش بختی ثابت ہوئی کیوں کہ شہر کسی فاسل کی طرح ازمنۂ وسطیٰ ہی میں منجمد ہو کر رہ گیا۔ بیسویں صدی میں سیاحوں کی دل چسپی کو دیکھتے ہوئے پورے شہر کو اتنی عمدگی سے محفوظ رکھا گیا ہے کہ ایسا لگتا ہے جیسے پورا شہر ہی میوزیم ہے۔

طلیطلہ کی گلیاں اونچی نیچی اور تنگ ہیں۔ ان کے فرش ناہموار پتھروں اور کھردری اینٹوں سے بنے ہوئے ہیں۔ میں قدیم پتھروں سے بنے ہوئے اونچی فصیلوں والے صدیوں پرانے مکانوں کو دیکھ کر سوچنے لگا کہ عین ممکن ہے یہاں اپنے قیام کے دوران جہاں گرد مائیکل سکاٹ بھی ابنِ سینا یا ابنِ رشد کے فلسفے کی کوئی دقیق گتھی سلجھاتے سلجھاتے انہی پیچیدہ دلیلوں کی سی گلیوں میں گھومتا ہو۔ آج کسی کو اس گھر یا اس محلے کا علم نہیں جہاں مائیکل سکاٹ رہتا تھا، لیکن طلیطلہ کو جس طرح سینت کر رکھا گیا ہے، عین ممکن ہے وہ گھر اب بھی انہی گلیوں میں کہیں قائم و دائم ہو۔

....

ابنِ رشد کے فلسفے سے میری دلچسپی تو فریڈرک کے دربار ہی سے ہو گئی تھی، کیوں کہ خود بادشاہ ابنِ رشد کے اس حد تک پرستار تھے کہ انھوں نے ابنِ رشد کے دو بیٹوں کو اپنے پاس بلا کر خاصا عرصہ مہمان رکھا تھا۔ لیکن اب طلیطلہ میں ابنِ رشد کی کتابوں پر کام کر کے مجھے معلوم ہوا کہ ان کا اصل مقام کیا ہے۔ میں نے بڑی محنت سے ان کی شرح ارسطو لاطینی میں منتقل کی، جو اس قدر مقبولِ عام ہوئی کہ چند برسوں کے اندر اندر اس کی ہزاروں نقلیں تیار ہو کر یورپ کے کونے کونے

میں پہنچ گئیں۔ اس دوران مجھے ابنِ رشد کے قلم سے لکھے ہوئے مخطوطات اکٹھا کرنے کی غرض سے قرطبہ کا سفر کرنے کا موقع بھی ملا۔ قرطبہ اپنی آخری سانسوں پر تھا۔ اس کی عظمت وسطوت قصہ کہانی بن کر رہ گئی تھی۔ میں نے ابنِ رشد کی قبر پر حاضری دی، اور دیر تک سوچتا رہا کہ اگر قدرت نے انھیں تھوڑی سی مہلت اور دی ہوتی تو مجھے ان کی دست بوسی کا موقع مل جاتا اور وہ میرے ذہن میں منڈلاتے کئی سوالوں کے خود جواب دے سکتے۔ میں نے قرطبہ میں جو مخطوطات اکٹھے کیے ان میں سے کچھ وہی تھے جو ان کی نعش کے ساتھ مراکش سے لائے گئے تھے اور ایک روایت کے مطابق وزن برابر کرنے کی خاطر گدھے کے دوسری طرف لادے گئے تھے۔

....

کچھ دیر تو انہی گلیوں میں تاریخ کی بانھوں میں بانھیں ڈال کر گھومتے ہوئے گزری، پھر البرتو سبھی سیاحوں کو سیڑھیاں اتروا کر سینٹ جوزف کے گرجے میں لے گیا، جہاں وہ ہمیں ال گریکو کی مشہور تصویر 'کاؤنٹ اورگازکی تدفین' دکھلانا چاہتا تھا، اور جس کے لیے اس نے بس ہی میں زمین ہموار کر لی تھی۔ البرتو ریٹائرڈ بس ڈرائیور سہی، لیکن پروفیشنل گائیڈ ہونے کے ناتے تاریخ کے علاوہ آرٹ پر بھی اس کی گہری نظر تھی۔ ال گریکو کی اس تصویر کے بارے میں اس نے پہلے تو دعویٰ کیا کہ یہ لیوناردو داونچی کی 'دالاسٹ سپر'، اور میڈرڈ کے پراڈو میوزیم میں موجود ویلاسکوئس کی 'میڈز آف آنز' کے ہمراہ دنیا کی تین عظیم ترین تصاویر میں سے ایک ہے۔ یہ اعلان کرنے کے بعد اس نے تصویر کے آگے کھڑے ہو کر بیس منٹ تک وہ لیکچر دیا کہ آرٹ، مذہب اور تاریخ کے قلابے ملا دیے۔ اس نے ال گریکو کے فن، تصویر کے جواز، حتیٰ کہ تصویر کے اندر موجود ایک ایک شخص کے کردار، پوز، اور خصوصیات پر بھرپور روشنی ڈالی۔ ال گریکو کی ایک لینڈ سکیپ کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ اگر آپ نے اس کی تصاویر نہیں دیکھیں تو تصور کیجیے کہ جیسے آپ کو خدانخواستہ 103 درجے کا بخار ہو، سر درد سے پھٹا جا رہا ہو، اور کھانسی کی دوا کی وجہ سے پپوٹے بھاری ہوں، مگر نیند پھر بھی آنکھوں سے دور ہو۔ ایسے عالم میں آپ کو دنیا ال گریکو کی آنکھوں سے نظر آئے گی۔

طلیطلہ میں ہمارا آخری سٹاپ پہاڑی کے دامن میں واقع طلیطلہ کا شمشیر سازی کا آخری کارخانہ تھا جہاں آج بھی دمشقی انداز میں تلواریں اور لوہے سے بنے ہوئے زیورات بنائے جاتے ہیں۔ کارخانے کے ایک طرف سیاحوں کی سہولت کے لیے ایک دکان بھی قائم کی گئی ہے

جہاں تلواروں اور چھوٹے بڑے خنجروں کے علاوہ سیاہ فولاد سے بنے زیورات بھی ملتے ہیں جن پر سونے کے پانی سے عربی انداز کے دلفریب نقش ونگار بنائے جاتے ہیں۔

کارخانے کے مالک نے ہتھوڑا رکھ کر ہمیں فولادگری کی دمشقی تکنیک کے بارے میں بتایا۔ اس تکنیک میں مختلف قسموں کے لوہے کی کئی تہوں کو گرم کر کے ایک ساتھ کوٹ کر تلوار کی شکل دی جاتی ہے۔اس سے تلوار بید کی شاخ کی طرح لچک دار ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد مضبوط بنتی ہے جو ساری زندگی شمشیرزن کا ساتھ دیتی ہے۔ایک دور میں کاٹ اور پائیداری کی بنا پر طلیطلہ میں بننے والی تلواروں کی یورپ بھر میں زبردست مانگ تھی۔تاہم بندوق اور پستول کی ایجاد کے بعد یہ صنعت دم توڑ گئی، اور آج یہ تلواریں امرا کے ڈرائنگ روم سجانے کے کام آتی ہیں۔

آخری دیا

1169ء

ایک دن میں قرطبہ میں اپنے معمول کے کام کاج میں مشغول تھا کہ شاہی ہرکارہ پورے کروفر کے ساتھ نمودار ہوا۔ مجھے مراکش میں امیر المومنین ابویعقوب یوسف کے دربار میں طلب کیا گیا تھا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ نہ جانے مجھ سے کیا خطا سرزد ہوئی ہے کہ یوں ہنگامی طور پر طلب کیا جا رہا ہے، اور دربار میں جا کر نہ جانے میرا کیا انجام ہوگا۔

ابویعقوب یوسف الموحدون خاندان کے دوسرے خلیفہ تھے۔ ان کی حکومت شمالی افریقہ سے لے سپین تک پھیلی ہوئی تھی اور قرطبہ بھی ان کی عمل داری میں آتا تھا۔ لیبیا کے کوہِ اطلس کے دامن میں آباد یہ بربر قبیلہ 38 سال قبل یوسف بن تاشفین کے قبیلے المرابطون کو شکست دے کر اقتدار میں آیا تھا۔ الموحدون کے بانی کا نام ابوعبداللہ ابنِ تومرت تھا جو امام غزالی کے شاگرد رہ چکے تھے۔ ابنِ تومرت کی سخت گیری کا یہ عالم تھا کہ ایک بار انھوں نے فاس شہر میں اس وقت کے امیر المومنین کی بہن کا راستا روک کر اسے سرِ عام جھڑکا تھا جو بازار میں اس زمانے کے رواج کے مطابق بے پردہ گھوم پھر رہی تھی۔ شہر سے جلاوطن کیے جانے پر ابنِ تومرت نے اپنے قبیلے میں جا کر لوگوں کو اکٹھا کیا اور حکومت کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ ان کا المرابطون پر الزام تھا کہ وہ اسلامی اصولوں سے دور ہٹ گئے ہیں اور لہو ولعب کی زندگی گزار رہے ہیں۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ المرابطون نے بھی یہی نعرہ لگا کر اقتدار حاصل کیا تھا کہ ان کے پیش رو دین کے راستے سے بھٹک گئے ہیں۔ شاید دین صراطِ مستقیم سے باریک تر وہ راستا ہے جس پر ایک وقت میں ایک ہی شاہی خانوادہ چل سکتا ہے۔

ابن تومرت تو انتقال کر گئے لیکن بہت جلد ان کے پیروکاروں نے المرابطون کو بے دخل کر

کے اپنی حکومت قائم کر دی اور اب روز بروز ان کا دائرۂ اثر بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے قرطبہ کے بازاروں میں افواہیں سنی تھیں کہ ابو یعقوب یوسف اندلس پر چڑھائی کرنے کی تیاریوں میں مشغول ہیں۔ اب اسی امیر کی جانب سے دربار میں حاضری کے بلاوے نے مجھے مخمصے میں ڈال دیا تھا۔

....

سات مارچ 1277ء

پیرس میں نوٹرے ڈیم کے عظیم کلیسا کے زیرِ سایہ یونیورسٹی آف پیرس پر آج خاموشی طاری ہے۔ کلیسا اور یونیورسٹی دونوں کی داغ بیل بارھویں صدی کے دوسرے نصف میں ڈالی گئی ہے اور اب سو سال گزرنے کے بعد دونوں ادارے اپنی بھرپور آب و تاب دکھا رہے ہیں۔ لیکن مارچ کی اس صبح پیرس کا بشپ سٹیون ٹیمپیئر بے حد طیش میں ہے۔ کل رات اسے روم سے پوپ نے تادیبی خط بھیجا ہے جس میں اسے تمام تر صورتِ حال کا ذمے دار ٹھہراتے ہوئے بدترین نتائج کی ملفوف دھمکی دی گئی ہے۔

آج ٹیمپیر نے یونیورسٹی کے تمام اساتذہ اور دوسرے عملے کو صبح ہی صبح یونیورسٹی کے بڑے دالان میں حاضر ہونے کا حکم دیا ہے۔ اساتذہ ایک دوسرے سے اشاروں میں پوچھتے ہوئے پہنچنے لگے کہ آخر مسئلہ کیا ہے، لیکن کسی کو اس غیر معمولی طلبی کی وجہ معلوم نہیں تھی۔ جب سب عملہ حاضر ہو گیا تو بشپ نے ان کے ہاتھوں میں ایک طویل فہرست تھما دی۔ یونیورسٹی کے پروفیسروں نے سوالیہ نظروں سے اسقف کی طرف دیکھا تو وہ گرج کر بولا، 'اس فہرست میں کتابوں کے نام درج ہیں، اگر آج کے بعد سے یونیورسٹی کا کوئی استاد ان میں سے کسی کتاب کو پڑھاتا ہوا پایا گیا تو اسے نہ صرف یونیورسٹی سے خارج کر دیا جائے گا بلکہ کلیسا سے بھی راندۂ درگاہ قرار دے دیا جائے گا۔'

یہی نہیں بلکہ ٹیمپیر نے اس فتوے میں طلبا کو بھی شامل کرنے سے گریز نہیں کیا۔ 'اگر کوئی طالب علم ان کتابوں کا درس سنتے پایا گیا اس کو بھی فی الفور یونیورسٹی سے کان پکڑ کر نکال باہر کر دیا جائے گا۔'

یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ بشپ ٹیمپیر نے کتابوں پر برہمی کا اظہار کیا ہو۔ سات برس قبل اس نے سینٹ آگسٹائن کے پیروکار فلسفی ہنری گینٹ کے ایما پر 13 کتابوں کی سرکاری طور پر مذمت

کی تھی۔ اس فہرست میں ہر قسم کی کتابیں تھیں، لیکن ایک کتاب ایسی بھی تھی جس نے بشپ کو خاص طور پر چراغ پا کیا تھا۔ یہ ابنِ رشد کی لکھی ہوئی ارسطو کی تفسیر تھی۔ یہ کتاب اس وقت یورپ بھر میں مقبول تھی اور اس نے کلیسا کو اس قدر تشویش میں مبتلا کر دیا تھا کہ اس وقت کے پوپ جان 21 کو خاص طور پر تنبیہی خط بھیجنا پڑا تھا۔ لیکن بشپ ٹیمپیر یونیورسٹی آف پیرس کا پہلا وائس چانسلر نہیں تھا جس نے ابن رشد کی تصنیفات پر پابندی لگائی ہو۔ اس سے پہلے 1210ء اور پھر 1215ء میں بھی ابنِ رشد کے خلاف ایسی ہی کارروائی کی گئی تھی۔

....

حکم عدولی کی گنجائش نہیں تھی، اس لیے میں شاہی ہرکاروں کے ہمراہ دارالخلافہ مراقش روانہ ہو گیا۔ پہلے تو ہم سڑک سے اشبیلیہ پہنچے، پھر وہاں سے بحری جہاز میں بیٹھ کر افریقہ کے مغربی کنارے کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے دارالبیضا پہنچ گئے۔ یہاں سے ایک بار پھر برّی سفر شروع ہوا جو دو ہفتے بعد مراقش پہنچ کر ختم ہوا۔ مراقش میرے لیے نیا شہر نہیں تھا۔ زمانۂ طالبِ علمی میں میں نے یہاں خاصا وقت گزارا تھا اور اس شہر سے خوب واقف تھا۔

میں نے اندلس میں چھوٹے چھوٹے طائفوں کے امیروں کے عالی شان محلات دیکھ رکھے تھے، ان کے مقابلے پر خلیفہ ابو یعقوب یوسف کا محل سادگی کا مرقع تھا۔ نہ راہ داریوں میں لہراتی ہوئی کنیزوں کے پرے، نہ خدام اور عمائد کی فوج ظفر موج، فضاؤں میں لہراتی ہوئی عود کی تانیں، نہ منقش دیواریں۔ بس ایک بڑا سا کمرا جس میں ایک پتھریلا چبوترا اور اس پر براجمان خلیفہ المومنین، اور ان کے پیچھے کھڑے ہوئے چند حکام۔ تاہم یہ دیکھ کر تھوڑی ڈھارس بندھی کہ خلیفہ کے پہلو میں مشہور فلسفی اور میرے استادِ محترم ابوبکر ابن طفیل بھی موجود تھے۔ میں نے فلسفے کے کئی دقیق مسائل انہی کی رہنمائی اور توجہ سے حل کیے تھے۔

خلیفہ نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بغیر کسی تمہید کے پوچھا:

'یہ فلسفی لوگ آسمانوں کے بارے میں کیا کہتے ہیں، کیا یہ ہمیشہ سے قائم دائم ہیں یا ماضی میں کسی مخصوص وقت میں تخلیق کیے گئے تھے؟'

یہ سوال سن کر میرا رنگ فق ہو گیا۔ اس سوال کے ڈانڈے بڑے دور جا کر ملتے تھے۔ یونانی فلسفیوں سے لے کر فارابی اور ابنِ سینا جیسے عظیم مسلمان فلسفی اس عقدے پر سر کھپا چکے

تھے۔ علما دو حصوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک حصہ وہ تھا جو افلاطون کا حامی تھا، اور اس کے خیال میں کائنات کسی مخصوص وقت میں معرضِ وجود میں آئی ہے۔ اس کے برعکس دوسرے گروہ کا خیال تھا کہ کائنات ہمیشہ سے قائم ہے اور ہمیشہ قائم رہے گی۔ اس گروہ کے سرخیل ارسطو تھے۔ زیادہ تر دینی علما مخصوص وقت والے نظریے کے حامی تھے اور کائنات کی ہمیشگی کے تصور کو قرآن کے منافی سمجھتے تھے۔

کیا امیر المومنین مجھے دام میں پھنسانا چاہتے ہیں؟ میرا امتحان لینا چاہتے ہیں؟ دینی معاملات پر الموحدون کی سخت گیری اور شدت میرے علم میں تھی۔ اگر خلیفہ کو میرا جواب پسند نہیں آیا تو کیا ہوگا؟

بوکھلاہٹ میں مجھے یہی مناسب نظر آیا کہ میں اس مسئلے سے مکمل لاعلمیت کا اظہار کر دوں، لیکن ابنِ طفیل بیچ میں بول پڑے:

> 'گھبراؤ نہیں، خلیفۂ معظم تمہارا امتحان نہیں لے رہے بلکہ یہ خود فلسفے کے گرویدہ ہیں اور اس مسئلے پر تمہاری رائے جاننا چاہ رہے ہیں۔'

خلیفہ نے بھی میرا تذبذب بھانپ لیا تھا۔ انھوں نے استادِ محترم کی تائید کرتے ہوئے میرا حوصلہ افزائی کی۔ کہنے لگے کہ چلو تمہاری جھجک دور کرنے کے لیے پہلے میں اس مسئلے پر جو کچھ مجھے معلوم ہے، وہ تمھیں بتا دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر پہلے تو انھوں نے یونانی حکما کے خیالات کا خلاصہ بیان کیا، پھر اس پر مسلمان فلاسفہ نے جو اعتراضات کیے تھے ان کا احاطہ کرنا شروع کر دیا۔ میں یہ سن کر حیرت زدہ رہ گیا، صاف معلوم ہوا تھا کہ خلیفہ نے فلسفے کا گہرا مطالعہ کر رکھا ہے۔ ان کی گفتگو سے شہ پا کر میں نے پوری دل جمعی کے ساتھ، دلائل اور براہین کی روشنی میں اپنا مؤقف دل کھول کر بیان کیا۔ میرا بیان جب ختم ہوا تو خلیفہ اور استادِ محترم دونوں کے منھ سے بیک وقت سبحان اللہ نکلا۔ جاتے جاتے سلطان نے مجھے خلعت اور ایک شان دار گھوڑے سے نوازا۔

....

بشپ ٹیمپیئر نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ اگلے چند روز میں ایک رسالہ لکھ کر ابنِ رشد اور ان کے پیروکاروں کے نظریات کو نشانہ بنایا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ ٹیمپیئر نے علمِ فلسفہ کے خلاف عمومی طور پر اور ابنِ رشد کے خلاف خصوصی طور جو الزامات لگائے تھے، وہ قریب قریب وہی تھے جو

ایک صدی قبل امام غزالی اپنی کتاب تہافتہ الفلاسفہ میں لگا چکے تھے، اور ابنِ رشد ان کا پہلے ہی مسکت جواب دے چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مائیکل سکاٹ اور طولیدو کے دوسرے مترجمین کی بدولت جن طلبہ یا اساتذہ کی رسائی ابنِ رشد کی کتابوں تک تھی، ان پر بشپ کے فرامین و براہین کا وہی اثر ہوا جو بطخ کے پروں پر پانی کا ہوا کرتا ہے۔

بار بار ابنِ رشد کو خاص طور پر نشانہ بنانے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی تعلیمات اس قدر مقبول تھیں کہ پابندیوں کے حکم ناموں کی سیاہی خشک ہوتے ہی ابنِ رشد کے شیدائی پھر سے اس کی کتابوں کی طرف رجوع کر لیتے تھے۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایک مسلمان فلسفی کی کتابوں میں ایسی کیا بات تھی جس پر اعلیٰ ترین عیسائی قیادت کو بار بار اس قدر انتہائی اقدام پر مجبور ہونا پڑا؟

فلسفہ اور مذہب صدیوں سے ایک دوسرے کے سامنے مخالف فوجوں کی طرح صف آرا رہے ہیں۔ اگر فلسفہ اور مذہب باہم متصادم ہوں تو پھر انسان کو کون سی راہ اختیار کرنی چاہیئے؟ ابنِ رشد کے نزدیک اس ٹیڑھے سوال کا جواب بہت آسان ہے: فلسفے کا مقصد وجود کے حقائق پر غور و فکر کرنا ہے، کیوں کہ یہ حقائق ہمیں خالق کے بارے میں علم عطا کرتے ہیں، جتنا ان کے بارے میں ہمارا علم زیادہ مکمل ہوگا خالق کے بارے میں بھی ہمارا علم اتنا ہی مکمل ہوگا۔ ابنِ رشد عقیدہ بمقابلہ عقل میں عقل (فلسفہ) کے حق میں جھکاؤ رکھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ چوں کہ وحی حق پر مبنی ہے اور ہمیں حق کی کھوج پر مائل کرتی ہے، اس لیے بطورِ مسلمان ہمیں کلی طور پر یقین رکھنا چاہیئے کہ کوئی ثابت شدہ منطقی اصول وحی کے خلاف نہیں ہوسکتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر قرآن کی کوئی آیت سائنس کے کسی اصول کی نفی کرتی ہوئی نظر آتی ہے تو اس آیت کی نئے سرے سے تعبیر کی ضرورت ہے۔

ابنِ رشد کا یہ نظریہ کہ کائنات کو وحی کے بغیر، انسانی عقل اور منطقی اصولوں سے سمجھا جا سکتا ہے، نیا نہیں تھا۔ اس سے قبل ان کے دوست ابنِ طفیل اور دوسرے فلسفی انھی راستوں سے گزر چکے تھے، لیکن یہ ابنِ رشد ہی تھے جنھوں نے اس عمل کا سب سے زیادہ گہرائی سے مطالعہ کیا اور اس کے بارے میں تسلسل سے لکھتے رہے۔ ارسطو کی کتابوں کی تفسیر کے علاوہ ان کی عظیم تصنیف 'مذہب اور فلسفے میں ہم آہنگی' میں ان مسائل کو بے مثال جرات کے ساتھ چھیڑا گیا ہے۔

ابنِ رشد کی آواز اسلامی دنیا میں تو صحرا کی اذان ثابت ہوئی، تاہم مغرب میں ان کی کتابیں اور تعلیمات ہاتھوں ہاتھ لی گئیں۔ وجہ یہ کہ تیرھویں اور چودھویں صدیوں کے یورپ کو بھی اسی قسم کے سوالات کا سامنا تھا کہ مذہب اور عقل میں کیوں کر مطابقت پیدا کی جائے، اور اگر مذہب اور عقل میں کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو کیا کیا جائے؟ اس سوال کا جواب عظیم یونانی فلسفی ارسطو کے ہاں ملتا ہے۔

....

بعد میں میری غیر موجودگی میں بادشاہ نے استاد ابنِ طفیل سے کہا کہ یونانی حکما کی کتابیں انتہائی دقیق ہیں، اور طالب علموں کو انھیں سمجھنے میں بڑی دقت ہوتی ہے۔ اس لیے ابن طفیل کو چاہیے کہ وہ ان کی تفسیر لکھیں۔ ابنِ طفیل نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ ان کی عمر اور صحت اس پیچیدہ کام کی اجازت نہیں دیتی، تاہم انھوں نے اس مقصد کے لیے میرا نام تجویز کیا۔

اگلے دن ابنِ طفیل خود میری قیام گاہ پر تشریف لائے اور کہنے لگے کہ 'اگر دنیا میں کوئی شخص یہ کام کر سکتا ہے تو وہ تم ہی ہو۔ تم ایسا کرو کہ ان کا خلاصہ لکھو، پھر ان کے خاص خاص نکات کی تشریح آسان زبان میں بیان کرو تا کہ عام لوگ بھی ان کو سمجھ سکیں۔ تم اس کام سے عہدہ برآ ہونے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہو۔'

چناں چہ میں نے شاہی سرپرستی میں ارسطو کی کتابوں کی جامع تفاسیر لکھنے کا بیڑا اٹھایا اور جب تک صحت نے اجازت دی، میں اسی کام میں منہمک رہا۔ اسی دوران مجھے پہلے اشبیلیہ کا قاضی بنایا گیا، پھر بعد میں قرطبہ کا قاضی القضا تعینات کر دیا گیا۔ یہ عہدہ میرے لیے خاص طور پر باعثِ فخر تھا کیوں میرے دادا ابوالولید محمد بن رشد اسی منصب پر فائز رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ شاہی حکیم کے فرائض بھی میرے سپرد کر دیے گئے۔

بہت جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ارسطو کی ایک تفسیر سے کام نہیں چلے گا، اس لیے میں نے تین قسم کی تفاسیر لکھنا شروع کر دیں۔

جامع: سادہ الفاظ میں فلسفے کے بنیادی نکات کا احاطہ

تلخیص: مختصر شرح

تفسیر: ارسطو کے خیالات و نظریات پر مفصل تنقید و تنقیص

ارسطو کی مفصل شرح وتنقید لکھنا میرے اندازے سے کہیں مشکل ثابت ہوا۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ میں ارسطو کے عربی تراجم پر کام کر رہا تھا، جو براہِ راست یونانی سے نہیں بلکہ سریانی کے وسیلے سے کیے گئے تھے۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ بہت سے ناقص مترجمین ومرتبین نے کئی ایسی چیزیں بھی ارسطو کی کتابوں میں شامل کر دی تھی جو اس کی لکھی ہوئی نہیں تھیں۔ دوسروں کا تو کیا کہنا، ملتِ اسلامیہ کے عظیم سپوت ابنِ سینا جیسے عالی دماغ فلسفی نے بھی اپنی تحریروں میں کئی ایسے نکات کو ارسطو کا سمجھ کران پر خیال آرائی کی تھی جو ارسطو کے نہیں، بلکہ اس کے مرنے کے کے پانچ سوسال بعد نوافلاطونی حکمانے تحریر کیے تھے۔ ان میں سے کچھ چیزیں تو ایسی بھی تھیں کہ وہ اگر ارسطو کو کسی کتاب میں ملتیں تو وہ اس کتاب کو اٹھا کر دالان میں پھینک دیتا۔

....

دورِ ظلمات میں ڈوبے یورپ کا اصل مسئلہ یہ تھا کہ بارہویں صدی سے قبل یورپ میں ارسطو محض ایک نام تھا۔ اس وقت وہاں اس کی صرف ایک ہی کتاب، یعنی منطق پر مبنی ایک رسالہ دستیاب تھا۔ اس کے علاوہ یورپ ارسطالیسی فلسفے سے یکسر ناآشنا تھا۔

اپنے استاد افلاطون کے برعکس ارسطو تمام علم عقل کے ذریعے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یہ وہ نقطۂ نظر تھا جو یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے مسلمہ اصولوں سے متصادم تھا۔ ارسطالیسی دنیا تخلیق کردہ نہیں، بلکہ ابدی تھی۔ اس میں انسانی روح کی دائمیت کا بھی کوئی تصور نہیں تھا۔

ابنِ رشد نے ارسطو کے ان خیالات کو مغرب تک پہنچانے کے لیے پل کا کام کیا۔ جب تیرہویں صدی میں یورپ میں ارسطو متعارف ہوا تو ساتھ ہی ساتھ ابنِ رشد کا ستارہ بھی بلند ہوتا گیا کیوں ارسطو کو ان تفاسیر کے بغیر سمجھنا آسان نہیں تھا۔ ابنِ رشد کی لکھی ہوئی تفاسیر وشروح کو سترہویں صدی تک یورپ میں استناد کی حیثیت حاصل رہی۔ ازمنۂ وسطیٰ کے یورپ میں ان کا نام کلیسا اور عقل کی کشمکش میں عقل کے داعی کی حیثیت سے منسلک ہوگیا، جس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ تیرہویں صدی میں پیرس سے ان کے نام سے ایک تحریک اٹھی جس نے یورپ کے علمی ڈھانچے کی بنیادیں ہلا دیں۔ اس تحریک کو ابنِ رشدی ازم کہا جاتا ہے۔

ابن رشدی ازم کی بنیاد عقل بمقابلہ عقیدہ تھی، اور ابنِ رشدیوں کا خیال تھا کہ عقل بمقابلہ عقیدہ میں عقل کا پلہ بھاری ہونا چاہیے۔ تحریک کے دو پہلو تھے، اول یہ کہ ایسے معاملات میں

جہاں مذہبی نظریات عقل سے متصادم ہوں، ان کی نئے سرے سے تشریح کی جائے۔ دوسرے یہ کہ فلسفیانہ معاملات میں جو طریقۂ کار اختیار کیا جاتا ہے، وہ مذہبی معاملات میں برتے جانے والے طریقۂ کار سے مختلف ہے۔ ابنِ رشدی تحریک کے داعین نے مؤقف اختیار کیا کہ مذہب کا مقصد فلسفیانہ حقائق کو عوام الناس کے لیے سادہ انداز میں پیش کرنا اور سماجی ہم آہنگی کو برقرار رکھنا ہے، نہ کہ بلند تر حقائق کی کھوج لگانا۔ وغیرہ۔

اس تحریک کے ایک سرکردہ داعی اور اپنے دور کے بااثر فلسفی اور طبیب بطروس دے ابونو تھے۔ وہ اس وقت یونیورسٹی آف پیرس کے طالبِ علم تھے جب وہاں ابنِ رشدی تحریک اپنے عروج پر تھی۔ بطروس فارغ التحصیل ہونے کے بعد 1306ء میں اٹلی کی یونیورسٹی آف پادوا سے وابستہ ہو گئے، جہاں انھوں نے آتے ہی ارسطو اور ابنِ رشد کو یونیورسٹی کے نصاب میں شامل کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پادوا ارسطالیسی اور ابنِ رشدی تعلیمات کا گڑھ بن گئی۔ بطروس نے اپنے لیکچروں میں ابنِ رشد سے مستعار 'سائنسی طریقۂ کار' کو یورپ میں متعارف کروایا، جس میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ بائبل اور مذہبی روایت سچائی کی کھوج لگانے کے لیے ناکافی ہیں اور سچائی تک رسائی کے لیے منطق، مشاہدہ اور تجربہ ضروری اوزار ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ باتیں کلیسا کو ہضم نہیں ہو سکتی تھیں، چناں چہ کلیسا نے بطروس پر مقدمہ دائر کر دیا جس میں ان کی کتابوں میں موجود 55 مختلف نظریات کو کلیسا سے متصادم قرار دیا گیا تھا۔ بالآخر بطروس کو منحرف قرار دے کر ان کو الاؤ میں سرِ عام زندہ جلانے کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ لیکن خوش قسمتی سے مقدمے کا فیصلہ آنے سے پہلے ہی بطروس کا 1315ء میں انتقال ہو چکا تھا۔ لیکن کلیسا کلیجہ کا اس پر بھی ٹھنڈا نہیں ہوا اور پادریوں نے حکم دے دیا کہ زندہ بطروس نہ سہی، اس کی لاش کو قبر سے نکال کر مقدمے کے فیصلے پر عمل درآمد کیا جائے۔ بطروس کے شاگردوں کو پتا چلا تو انھوں نے راتوں رات لاش قبر سے غائب کر دی۔ مجبوراً کلیسا کو بطروس کا پتلا الاؤ میں جلانے پر اکتفا کرنا پڑی۔

بطروس کے جلتے ہوئے پتلے سے جو چنگاریاں پھوٹیں انھوں نے دور دور تک آگ لگا دی۔ ازمنۂ وسطیٰ کے سب سے بڑے اور سب سے مقتدر فلسفی ٹامس ایکویناس کو اگرچہ ابنِ رشدی نہیں کہا جا سکتا لیکن وہ ابنِ رشد سے بے حد متاثر تھے۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ ان کی کتابوں میں ابنِ رشد کا حوالہ 503 بار آتا ہے۔

بطروس کے ہم عصر اور مشہور اطالوی شاعر دانتے الگیری بھی ابنِ رشد کی کشش کا شکار ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ایک طرف تو انھوں نے اپنی ڈیوائن کامیڈی میں ابنِ رشد کو اعلیٰ مقام دیا ہے، وہیں انھوں نے ایک سیاسی کتاب 'دنیاوی حکومت' بھی لکھی جس پر ابنِ رشدی فلسفے کا واضح اثر نظر آتا ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ ابنِ رشد درخت کا وہ تنا ہیں جہاں سے ازمنۂ وسطیٰ کے مغربی فلسفے کی شاخیں پھوٹتی ہیں۔ انھی کی تعلیمات ونظریات نے یورپ میں گذشتہ سات صدیوں سے طاری دورِ ظلمات کو ختم کرنے میں مدد دی۔ ان تاریک صدیوں میں پادریوں نے ہر طرح کے علم پر اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی تھی اور کسی کو ان پر سوال اٹھانے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن اب یونانی اور اسلامی فکر نے یورپی اذہان میں کشادگی پیدا کرنے کا فریضہ سرانجام دے کر نشاۃ الثانیہ کی بنیادگزاری کے لیے بنیادی پتھر کا کام دیا۔

....

دن کے وقت میں اپنے دفتری، سرکاری اور شاہی معاملات میں مصروف رہتا تھا، فلسفہ نگاری کا کام شمع کی روشنی میں ہوتا تھا جو رات گئے تک چلتا رہتا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، ہوش سنبھالنے کے بعد میری زندگی میں صرف دو راتیں ایسی آئیں جن میں میں نے لکھنے پڑھنے کا کام نہیں کیا، ایک میری شادی کی رات، اور دوسری والد کے انتقال کی رات۔

1184ء میں امیر المومنین ابو یعقوب یوسف میدانِ جنگ میں تیر کا نشانہ بن کر راہیِ ملکِ عدم ہو گئے۔ مسندِ اقتدار ولی عہد ابو یوسف یعقوب المنصور کے ہاتھ آئی، جو اپنے والد ماجد کی طرح بڑے علم دوست انسان، قابل حکمران، اور عمدہ جنگی کمان دار تھے۔ ان کے دور میں بھی مجھے وہ تمام سہولیات حاصل رہیں جو ان کے والد کے زمانے میں تھیں۔ لیکن جیسا کہ دنیا کا دستور ہے، بعض لوگوں کو میرا یہ اثر ورسوخ ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ چناں چہ وہ مجھے نیچا دکھانے کی کوششوں میں سرگرم ہو گئے۔ ان کو انھیں اصل شکایت میرے عقلیت پسندانہ خیالات سے تھی۔ میں نے ابو حامد الغزالی کی کتاب 'تہافتہ الافلاسفۃ' (فلسفیوں کی بے ربطی) کے رد میں ایک کتاب تحریر کی تھی 'تہافتہ التہافۃ' (بے ربطی کی بے ربطی)۔ اپنی کتاب میں الغزالی نے علمِ فلسفہ پر بیس سوال اٹھا کر اسے بڑے شدومد سے رد کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ فلسفہ گمراہی کی طرف لے جاتا

ہے۔ نیز یہ کہ وحی کے ہوتے ہوئے فلسفے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے علت و معلول پر بھی سوال اٹھائے تھے، جس سے تجربے اور مشاہدے کی اہمیت و افادیت صفر ہو جاتی ہے۔ مثلاً انھوں نے لکھا کہ اگر روئی اور آگ ایک جگہ اکٹھے ہوں تو روئی آگ کی وجہ سے نہیں، بلکہ اللہ کی مرضی سے جلے گی۔ اس کا مقصد یہ ہوا کہ دنیا کے بارے میں کوئی بھی علم تجربے یا مشاہدے سے نہیں حاصل کیا جا سکتا، بلکہ ہر سوال کا جواب صرف اور صرف مذہب کے پاس ہے۔ میں نے اپنی کتاب میں الغزالی کے ہر اعتراض کا منطقی طریقے سے جواب دے کر اسے رد کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ بات الموحدون کو پسند نہیں آنی تھی کیوں اس سلسلے کے بانی ابنِ تومرت الغزالی کے شاگرد رہ چکے تھے۔ یہ الگ بات کہ میرے مخالفین کے اندر علمی اور عقلی طریقۂ کار سے دلائل کو باطل ثابت کرنے کی صلاحیت مفقود تھی، اس لیے وہ چھوٹی چھوٹی غیر متعلق باتیں ڈھونڈ ڈھانڈ کر مجھے بدنام کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔

ایک بار میں نے ارسطو کی کتاب 'تاریخ الحیوانات' کی شرح میں کہیں لکھ دیا کہ میں نے شاہِ بربر کے باغات میں زرافہ دیکھا تھا۔ بس پھر کیا تھا، حاسد اسی بات کو لے اڑے کہ میں نے بادشاہ کی مناسب توصیف و تکریم نہیں کی اور محض شاہِ بربر لکھ کر ان کی توہین کی ہے۔ اس کے بعد میری کسی تحریر کا ایک ٹکڑا ان کے ہاتھ لگ گیا، جس میں میں نے کسی یونانی کی تحریر نقل کرتے ہوئے لکھ دیا تھا کہ 'زہرہ دیویوں میں سے ایک دیوی ہے۔' حالاں کہ نقلِ کفر کفر نہ باشد، لیکن لوگوں نے میرے اپنے خط میں لکھی ہوئی یہ تحریر خوب خوب مشہور کی کہ دیکھو ابنِ رشد یہ کہتا ہے۔

لیکن شاید جس بات کا سب سے زیادہ اثر ہوا وہ یہاں لکھتا ہوں۔ ہوا یوں کہ میں نے افلاطون کی مشہور کتاب 'جمہوریہ' کی بھی شرح لکھی تھی۔ اس کتاب میں ایک مثالی نظامِ حکومت پر بحث کی گئی ہے۔ میں نے اس کتاب پر تنقید لکھتے ہوئے مثالی حکومت کے بارے میں اپنے خیالات و نظریات بھی پیش کیے گئے جن میں الموحدون کی حالیہ حکومت کا بھی ذکر آ گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ مثالی حکومت نہیں تھی اس لیے شاید میرے قلم سے کچھ سخن گسترانہ باتیں بھی نکل گئیں۔ حاسدوں نے نمک مرچ لگا کر انھیں خلیفہ کے سامنے پیش کر دیا۔ المنصور ویسے تو میری بڑی قدر کرتے تھے لیکن کہتے ہیں کہ قطرہ قطرہ پانی سے سنگِ خارا میں بھی سوراخ ہو جاتا ہے۔ وہ اس بات سے اس قدر برافروختہ ہو گئے کہ انھوں نے مجھے میرے عہدے سے معزول کر کے شہر بدر کر دینے

کا حکم صادر کر دیا۔ انھوں نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ میرے ساتھ میرے عزیزوں اور شاگردوں کو بھی دیس نکالا دے دیا، ساتھ ہی ساتھ انھوں نے میری فلسفے سے متعلق تمام کتابوں کو جلانے کا حکم بھی صادر کر دیا۔ شہر بدری سے قبل قرطبہ میں میرے سامنے میری کتابیں گھوڑوں پر لائی جاتی تھیں اور الاؤ میں جھونک دی جاتی تھیں۔ ان کتابوں کا دھواں قرطبہ کے آسمان پر رات گئے تک اور میرے دل پر برسوں تک کابوس کی طرح چھایا رہا۔

....

دورِ تاریک کے یورپ میں ابنِ رشد کی بے پناہ مقبولیت اور جاذبیت کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ انھیں اپنے خیالات کی وجہ سے شاہی عتاب کا شکار ہونا پڑا، ان کی کتابیں جلا دی گئیں، ایک ہجوم نے ان کی سرِ عام توہین کی، اور انھیں جلاوطن کر دیا گیا، اس لیے وہ کلیسا کے جبر تلے دبے ہوئے یورپ کے لیے سقراط کی طرح کے رول ماڈل کی حیثیت اختیار کر گئے۔ پادواہی کے ایک اور مشہور ابنِ رشدی جان آف جندون کا یہ قول مشہور ہے کہ

'ابنِ رشد بے عیب اور بے مثال حکیم اور حق کے نڈر محافظ تھے۔'

فکری تاریخ میں ابنِ رشد سقراط، سپنوزا، اور گیلیلیو کی طرح وہ شخصیت ہیں جنھیں ان کے خیالات وتصورات کی بنا پر نشانہ بنایا گیا۔

دل چسپ اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ابنِ رشد کا ورثہ مشرق اور مغربی دنیاؤں میں مختلف سمتوں میں پھلا پھولا۔ جیسا کہ ہم نے اوپر دیکھا، مغرب میں انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا جب کہ اسلامی دنیا میں انھیں آنکھیں مندتے ہی بھلا دیا گیا۔ حتیٰ کہ ان کے شاگرد ابنِ تلموس نے بھی اپنی کتابوں میں ابنِ رشد کا ذکر نہیں کیا حالانکہ ان کے خیالات واضح طور پر اپنے استاد سے مستعار ہیں۔ اور تو اور، مشہور صوفی معلم محی الدین ابنِ العربی نے بھی اپنی تحریروں میں اپنے ہم وطن اور ہم عصر مفکر کو نیچا دکھانے کی کوشش کی ہے۔

بعد میں آنے والی صدیوں کے دوران اسلامی دنیا میں ابنِ رشد کا ذکر بطور طبیب تو پایا جاتا ہے، لیکن بطور فلسفی نہیں۔ حتیٰ کہ ان کی تحریر کردہ بعض کتابیں صرف لاطینی اور دوسری مغربی زبانوں میں کیے گئے تراجم کی شکل میں دستیاب ہیں، اصل عربی کتابوں کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔

ساقیِ اربابِ ذوق

PDF BOOK COMPANY

مدد، مشاورت، تجاویز اور شکایات :

Muhammad Husnain Siyalvi
0305-6406067
Sidrah Tahir
0334-0120123
Muhammad Saqib Riyaz
0344-7227224

برقی کتب

وہ جو تاریک راہوں میں مارے گئے

طولیدو سے نکلتے ہی ہمارا اندلس کا ٹور ختم ہو گیا۔ ڈان ہوان جو اس سے پہلے سب مسافروں کے آرام کا خیال رکھنے میں بہت مستعدی دکھاتے تھے، اب ہاتھ جھاڑ کر سب سے پچھلی نشست پر جا کر یوں دراز ہو گئے جیسے چڑیا بچوں کو پال پوس کر بڑا کر دینے کے بعد گھونسلے سے نکال کر اپنی ذمے داری سے عہدہ برآ ہو جاتی ہے۔ البرتو صاحب پہلے ہی رخصت ہو چکے تھے۔ بس اب اے 42 نامی موٹروے پر شمال مشرق کی سمت میڈرڈ کی جانب اڑی چلی جا رہی تھی۔ بیشتر سیاح بھی سفر کے آخری لمحوں میں تھکاوٹ کا شکار تھے۔ اکثر لوگ خاموش تھے، صرف پیچھے کی ایک سیٹ پر آسٹریلیوی مسلمان جوڑا محوِ گفتگو تھا۔ میں نے نظریں کھڑکی سے باہر جما دیں۔ پہاڑی پر سے طولیدو کے آخری آثار نظر آ رہے تھے۔ غالباً یہ وہی جگہ ہے جہاں سے عظیم مصور ال گریکو نے وہ شہرہ آفاق تصویر بنائی ہے، جس میں طولیدو سیاہ طوفانی بادلوں کے نیچے گویا دہشت کے مارے تھر تھر کانپ رہا ہے۔ جیسے آسمان کو شہر کی کسی بات پر شدید غصہ ہے اور وہ اس پر برس پڑنے کو ہے۔

ایسی پینٹنگ صرف سولہویں صدی کے انتہائی کٹر ماحول ہی میں بنائی جا سکتی تھی۔ اسی مذہبی جبر اور کیتھولک کٹر پن کا پہلا نشانہ اندلس کی یہودی آبادی بنی۔ تین اگست 1492ء کو جب کرسٹوفر کولمبس فرڈیننڈ اور ازابیلا کی طرف سے نئی دنیاؤں کی دریافت کا پروانہ لے اشبیلیہ سے تین جہازوں اور 87 افراد پر مشتمل عملے کو لے کر ایک ان دیکھی منزل کی جانب روانہ ہوا تو اس سے صرف ایک دن پہلے سپین بھر سے یہودیوں کے زبردستی اخراج کا حکم نامہ جاری ہو چکا تھا۔ یہ بات کولمبس کے لیے اس لیے خاص طور پر روح فرسا ثابت ہوئی ہوگی کہ جدید تحقیق سے یہ بات تقریباً ثابت ہو چکی ہے کہ کولمبس دراصل یہودی تھا اور اس نے ریاستی جبر سے بچنے کی خاطر عیسائیت کا

لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔

یہودیوں کا اخراج غرناطہ اور سپین کے دوسرے حصوں میں بسنے والے مسلمانوں کے خطرے کی گھنٹی تھا۔ دو جنوری 1492ء میں غرناطہ کے آخری امیر عبداللہ نے شہر کے دروازے جس معاہدے کے تحت فرڈیننڈ اور ازابیلا کی افواج کے لیے کھولے تھے، اس میں غرناطہ کے شہریوں کو اپنے مذہب پر چلنے کی مکمل آزادی کا عہد کیا گیا تھا۔ تاہم یہ آزادی صرف سات برس ہی جاری رہ سکی۔ 1499ء میں غرناطہ کے بڑے پادری فرانسسکو سیسنیروس نے مسلمانوں کو زبردستی عیسائی بنانے کی مہم شروع کر دی۔ کچھ مسلمانوں نے اس کے خلاف ہتھیار اٹھا لیے اور پہاڑوں میں جا چھپے، لیکن اس سے سپین کے کیتھولک پن کے شعلے مزید بھڑک اٹھے۔ غرناطہ کی تمام مسجدیں یا تو مسمار کر دی گئیں یا چرچوں میں تبدیل کر دی گئیں، شہر کے چوکوں میں ڈھیر لگا لگا کر عربی کی لاکھوں کتابیں نذرِ آتش کر دی گئیں۔ 1550ء کے لگ بھگ مسلم لباس، عربی اور بربر زبانوں، اور ناموں پر پابندی لگا دی گئی۔ جو مسلمان ظاہراً عیسائی بن گئے تھے انھیں سؤر کا گوشت کھانے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ پادریوں کے کارندے مسلمان گھروں کے باورچی خانوں میں جا جا کر معائنہ کیا کرتے تھے کہ آیا وہ سؤر کا گوشت پکاتے ہیں یا نہیں۔ غرناطہ میں 1492ء سے قبل سینکڑوں حمام تھے۔ ان سب کو مسمار کر کے نہانے پر بھی پابندی لگا دی گئی کیوں کہ نہانے کے عمل کو مسلم رسم سمجھا جاتا تھا۔

چاروں طرف سے پسے ہوئے اندلس کے مسلمانوں نے کوشش کی کہ وہ مسلمان ملکوں کے سامنے مدد کے لیے ہاتھ پھیلائیں۔ چناں چہ غرناطہ سے مسلمانوں کے سفیر ابن ازرق قاہرہ گئے جہاں انھوں نے مملوک سلطان قائت بے کے سامنے اندلس مسلمانوں کی حالتِ زار رکھتے ہوئے استدعا کی کہ وہ سپین کے حکمرانوں سے مسلمانوں کو زبردستی عیسائی بنانے کی مہم ختم کرنے کا مطالبہ کریں، ساتھ ہی دھمکی دیں کہ اگر یہ سلسلہ بند نہ ہوا تو مصر اور فلسطین میں آباد عیسائی آبادی کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جائے گا۔ لیکن مملوک اتنے طاقتور نہیں تھے کہ وہ ہسپانیہ جیسے امیر اور طاقت ور ملک سے ٹکر لے سکتے۔ چناں چہ جب فرڈیننڈ ثانی نے اپنا سفیر پیٹر مارٹائر قاہرہ بھیجا تو اس نے ایک طرف تو سارا قصور اندلسی مسلمانوں پر دھر دیا، تو دوسری طرف ڈھکی چھپی دھمکیاں بھی دیں کہ اگر مسلم ممالک کی عیسائی آبادی کے ساتھ کچھ ہوا تو ہسپانوی بحری بیڑا اسکندریہ کی

تجارت درہم برہم کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہزاروں میل دور سے اندلسی مسلمانوں کی مدد کے لیے آنا مملوک سلطان کے بس کی بات نہیں تھی، اس لیے اس نے خاموشی ہی پر اکتفا کی۔ ترک عثمانیوں نے کچھ فوجی ماہر ضرور بھیجے لیکن ان کی وجہ سے معاملات سدھرنے کی بجائے مزید بگڑ گئے۔

....

موٹروے کے اطراف جگہ جگہ کسی پہاڑ کے دامن میں، کسی کھلے میدان میدان میں بستی کے عقب میں، یا کسی ویرانے میں کسی ٹوٹے پھوٹے تنِ تنہا قلعے یا محل کے آثار نظر آتے ہیں، جس کا طرزِ تعمیر انسان کو کسی اور زمانے میں لے جاتا ہے۔ اگر کھنڈرات نہیں تو پھر کہیں کہیں پہاڑوں کے اوپر قطاروں میں کاہلی سے گھومتی ہوئی ہواچکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں، جو ایک بار پھر مسلم دور کی یاد دلاتی ہیں، کیوں کہ ہواچکی مسلمانوں ہی نے یورپ میں متعارف کروائی تھی۔

....

مسلمانوں سے مایوس ہو کر اندلسیوں نے فرانس، ہالینڈ، حتیٰ کہ برطانیہ تک سے مدد کی اپیل کی۔ ملکہ الزبتھ اول نے کسی قدر ہمدردی کا اظہار کیا، لیکن اس سے پہلے کہ معاملات آگے بڑھتے، 1603ء میں ملکہ کا انتقال ہو گیا، اور اس کے جانشین جیمز اول نے یہ سارا معاملہ داخلِ دفتر کر دیا۔ اس وقت سپین دنیا کا سب سے طاقت ور ملک بن چکا تھا، اس لیے کوئی اس سے بگاڑ پیدا کرنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔

....

غرناطہ سے طولیدو آتے وقت جب بس درختوں سے لدے ہوئے ایک درے پر پہنچی تو گائیڈ البرتو نے ایک ایسا واقعہ سنایا تھا جس سے طبیعت اداس ہو گئی تھی۔ البرتو کہہ رہے تھے کہ جب مسلمانوں کو زبردستی عیسائی بنانے کا حکم صادر ہو گیا تو بہت سوں نے ہتھیار اٹھا لیے اور ان جنگلوں میں جا بسے جہاں سے وہ آس پاس کی بستیوں پر دھاوا بولا کرتے تھے۔ پھر ہسپانوی لشکر ان کی تلاش میں آیا، چن چن کر ان باغیوں کو پکڑا گیا اور اس درے سے ہزاروں فٹ نیچے پھینک کر ہلاک کر دیا گیا۔

....

بہت سے مسلمان ظاہری طور پر عیسائی بن گئے، لیکن اندر سے اسلامی عقائد پر قائم رہے۔ انھیں موریسکو کہا جاتا تھا۔ 1504ء میں مسلمان اپنا کیس لے کر الجیریا کے مفتی الاعظم عبیداللہ احمد المغراوی کے پاس گئے، جنھوں نے ان کی شکایات پر خاصے غور و فکر کے بعد ایک فتویٰ جاری کیا جس کے تحت اندلسی مسلمانوں کو جبر کی صورتِ حال میں مندرجہ ذیل حکمتِ عملیاں اختیار کرنے کی چھوٹ دی گئی تھی:

- مسلمان بتوں کے سامنے مصلحتاً جھک سکتے ہیں (مثلاً گرجا گھروں میں عیسیٰ کی تصاویر اور بتوں کے سامنے)
- وضو اور غسل کرنے کے عمل کو معطل رکھا جا سکتا ہے۔ اس کے بدلے میں وہ کسی پاک چیز کی طرف اشارہ کر سکتے ہیں۔
- شراب پی جا سکتی ہے، بشرطیکہ اس سے منشا لطف اٹھانا نہ ہو
- اگر ناگزیر ہو تو سؤر کا گوشت اور دوسری حرام خوراک کھائی جا سکتی ہے، بشرطیکہ اسے دل سے حرام اور ناپاک سمجھا جائے۔
- سود لیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ بعد میں اس کا منافع خفیہ طریقے سے غریبوں میں بانٹ دیا جائے۔
- زبردستی کی صورت میں آخری حربے کے طور پر مسلمان اسلام سے اعلانیہ انکار کر سکتے ہیں، تاہم جو کچھ ان سے کھلے عام کہلوایا جا رہا ہے، وہ دل ہی دل میں اس کی تردید کریں۔

....

لیکن ان سب کارروائیوں کے باوجود کیتھولک پادریوں کی بھڑاس نہیں نکلی۔ وہ کبھی موریسکوؤں پر عثمانی ترکوں کے ساتھ ساز باز کا الزام لگاتے، کبھی انھیں عیسائیت کے لیے خطرہ قرار دیتے۔ آخر ہسپانیہ پر طارق بن زیاد کے حملے کے نو سو سال بعد 22 اگست 1609ء کی ایک صبح جب بلنسیہ صوبے کے موریسکو سو کر اٹھے تو کوچہ و قریہ میں ایک شاہی حکم نامے کی منادی دی جا رہی تھی۔

o　تمام موریسکو چار دن کے اندر اندر ہسپانیہ چھوڑ کر جہاں جی

چاہے، چلے جائیں۔

- وہ اپنے ساتھ اپنا تمام سامان لے جا سکتے ہیں، البتہ ان کے گھر، باغات، اور کھیت بحقِ سرکار ضبط ہو جائیں گے۔
- کرایہ تاجِ ہسپانیہ کی طرف سے ادا کیا جائے گا۔
- چار سال سے کم عمر کے بچے اس فرمان سے مستثنیٰ ہیں۔

....

اعداد و شمار مکمل تھے۔ بچاؤ کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اس وقت ہسپانیہ میں تین لاکھ کے لگ بھگ موریسکو تھے۔ ان میں سے کچھ ایسے تھے جو نسلوں سے دلی طور پر عیسائی بن چکے تھے، لیکن کسی کی کوئی بات نہیں سنی گئی، اور حیرت انگیز سرعت اور صفائی سے ان سب موریسکوؤں کو بندرگاہوں تک پہنچا دیا گیا جہاں ان سے شاہی فرمان کے برخلاف زبردستی کرایہ وصول کیا گیا۔ کچھ موریسکو شمالی پہاڑوں سے گزر کر وینس پہنچے، جہاں سے عثمانی ترکوں نے انھیں مسلمان ملکوں میں پہنچانے کا بندوبست کیا، لیکن اکثریت سمندر کے راستے شمالی افریقہ کے ملکوں کو سدھاری۔ بہت سوں کو راستے میں لوٹ کر قتل کر دیا گیا۔ جو مراکش یا الجیریا پہنچنے میں کامیاب ہوئے، انھیں نئے ملک میں بسنے میں بے پناہ مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ بہت سے موریسکو ایسے تھے جن کے بال سنہرے یا سرخ تھے، اور وہ صرف ہسپانوی زبان بولتے تھے، ہسپانوی کھانے کھاتے تھے اور ہسپانوی لباس پہنتے تھے۔ صدیوں سے یورپ میں قیام اور درجنوں نسلوں تک آپس میں شادیوں کی وجہ سے ان کے اندر عرب یا شمالی افریقی موروثی اثرات ختم ہو چکے تھے۔

کچھ موریسکو کسانوں نے افریقی سرزمین پر اندلس کی طرز کے زیتون کے باغات لگانے کی بھی کوشش کی۔ لیکن وقت کے پہیے کو الٹا گھمانا ممکن نہیں تھا۔ اکثر سفر کی صعوبتوں، فاقوں سے یا مقامی آبادی کے حملوں کا شکار ہو کر دم توڑ گئے۔ بچے کھچے موریسکو آنے والی صدیوں میں مقامی آبادیوں میں یوں مدغم ہوئے کہ ان کے نام و نشان ہی مٹ گئے۔ تاہم اب بھی مراکش میں کبھی کبھار کاستیلو، بلانکو، اور نیگرو جیسے نام ایک قدیم دردناک بازگشت کی طرح سنائی دیتے ہیں۔

....

2006ء میں اندلوسیا کی ایک جماعت نے پارلیمان میں قرارداد پیش کی کہ سپین سے نکالے ہوئے مسلمانوں کی اولاد کو ہسپانوی شہریت دینے میں سہولت پیدا کی جائے۔ ایسی سہولت ان یہودیوں کی اولاد کو پہلے ہی حاصل ہے جنھیں سپین سے دیس نکالا دیا گیا تھا۔ مزید یہ کہ 1968ء میں ویٹیکن نے سپین سے یہودیوں کے اخراج کے حکم نامے کو باقاعدہ طور پر واپس لے لیا تھا۔ ممکن ہے آنے والے برسوں میں موریسکوؤں کی اولاد کو بھی ایسی ہی کوئی سہولت مل جائے۔

....

بس یکساں رفتار سے موٹروے پر رواں دواں تھی۔ سورج ڈھلنے کے قریب تھا۔ اکثر سیاح اپنی اپنی سیٹوں پر سو رہے تھے۔ بس کے انجن کی ہلکی ہلکی خواب آور گھرر گھرر کے سوا ہر طرف خاموشی طاری تھی۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ دور مغربی پہاڑیوں پر شام کے سورج کا خون قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔ میں نے کھڑکی کا پردہ کھینچ کر برابر کیا اور نشست سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

☆☆......☆☆

کتابیات

- شہیدوں کی شاہراہ
- Poitiers AD 732: Charles Martel Turns the Islamic Tide. David Nicolle. Osprey. 2008
- Great Battles: Decisive Conflicts that have Shaped History. Christopher Jorgensen, 2010. Parragon
- God's Crucible: Islam and the Making of Europe, 570-1215. David Levering Lewis. W. W. Norton & Company. 2009
- A Vanished World: Muslims, Christians, and Jews in Medieval Spain. Chris Lowney. Oxford University Press, USA. 2006
- خودکش شہید
- Christian Martyrs in Muslim Spain. Kenneth Baxter Wolf.
- مہم جو شہزادی
- The History of Muslim Dynasties of Spain. Ahmad ibn Muhammad Al Makkari. Johnson Reprint Corporation. 1964

- عشق سے تیرا وجود
- The History of Muslim Dynasties of Spain. Ahmad ibn Muhammad Al Makkari. Johnson Reprint Corporation. 1964
- The Legacy of Muslim Spain. Salma Khadra Jayyusi (Editor). Brill Academic Publishers; 2nd edition. 2000
- Moorish Culture in Spain. Titus Burckhardt. Suhail Academy, Lahore, 1997
- طوطیِ ہزار داستاں
- The Arabic Role in Medieval Literary History: A Forgotten Heritage. Maria Rosa Menocal. University of Pennsylvania Press. 1990
- Moorish Culture in Spain. Titus Burckhardt. Suhail Academy, Lahore, 1997
- Flight of the Blackbird. Robert W Lebling Jr. Saudi Aramco World. 2004
- لذتِ پرواز
- The History of Muslim Dynasties of Spain. Ahmad ibn Muhammad Al Makkari. Johnson Reprint Corporation. 1964
- A Vanished World: Muslims, Christians, and Jews in Medieval Spain. Chris Lowney. Oxford University Press, USA. 2006
- اندلس کا تاج محل

- Moorish Culture in Spain. Titus Burckhardt. Suhail Academy, Lahore, 1997
- Revisiting al-Andalus: Perspectives on the Material Culture of Islamic Iberia and Beyond. G.D. Anderson and M. Rosser-Owen (Editors). Brill Academic Publishers. 2007
- The Legacy of Muslim Spain. Salma Khadra Jayyusi (Editor). Brill Academic Publishers; 2nd edition. 2000
- A Vanished World: Muslims, Christians, and Jews in Medieval Spain. Chris Lowney. Oxford University Press, USA. 2006
- The Ornament of the World: How Muslims, Jews and Christians Created a Culture of Tolerance in Medieval Spain. Maria Rosa Menocal. Back Bay Books; Reprint edition. 2003
- The History of Muslim Dynasties of Spain. Ahmad ibn Muhammad Al Makkari. Johnson Reprint Corporation. 1964

• کیسی بلندی کیسی پستی

- Moorish Culture in Spain. Titus Burckhardt. Suhail Academy, Lahore, 1997
- Ishbiliya: Islamic Seville. Paul Lunde. Saudi Aramco World. 2004
- The Legacy of Muslim Spain. Salma Khadra Jayyusi

(Editor). Brill Academic Publishers; 2nd edition. 2000

- The Poet King of Seville. Rose M Esber. Saudi Aramco World. 2004
- A Vanished World: Muslims, Christians, and Jews in Medieval Spain. Chris Lowney. Oxford University Press, USA. 2006
- The Ornament of the World: How Muslims, Jews and Christians Created a Culture of Tolerance in Medieval Spain. Maria Rosa Menocal. Back Bay Books; Reprint edition. 2003
- The History of Muslim Dynasties of Spain. Ahmad ibn Muhammad Al Makkari. Johnson Reprint Corporation. 1964
- آہ الحمرا
- Ibn Batuta: Travels in Asian and Africa.
- Tales of Alhambra. Washington Irving. The. University of Adelaide. 2012
- History of the reign of Ferdinand and Isabella. William Prescott. 1838
- The History of Muslim Dynasties of Spain. Ahmad ibn Muhammad Al Makkari. Johnson Reprint Corporation. 1964
- The Ornament of the World: How Muslims, Jews and Christians Created a Culture of Tolerance in Medieval

Spain. Maria Rosa Menocal. Back Bay Books; Reprint edition. 2003

- پانچ صدیوں بعد اذان

- Granada's New Convivencia. Tor Eigeland. Saudi Aramco World. September/October 2003

- شہر جو خود ترجمہ بن گیا

- An Inquiry into the Life and Legend of Michael Scot. James Wood Brown.
- Disciplina Clericalis: Petrus Alphonsi
- The Ornament of the World: How Muslims, Jews and Christians Created a Culture of Tolerance in Medieval Spain. Maria Rosa Menocal. Back Bay Books; Reprint edition. 2003

- ابنِ رشد پیرس میں

- Averroes and His Philosophy. Oliver Leaman. Curzon Press. 1998
- Averroes: His Life, Works, and Influence. Majid Fakhry. Oneworld. 2001
- Averroes and the Enlightenment: Averroes and the West: Oliver Leaman
- Averroes and the Enlightenment. Murad Wahbah (Editor). Prometheus Books. 1996
- A Vanished World: Muslims, Christians, and Jews in Medieval Spain. Chris Lowney. Oxford University

Press, USA. 2006

- How Islam Created the Modern World. Mark Graham. Amana Publiscations. 2006
- Moorish Culture in Spain. Titus Burckhardt. Suhail Academy, Lahore, 1997
- Ishbiliya: Islamic Seville. Paul Lunde. Saudi Aramco World. 2004
- The Ornament of the World: How Muslims, Jews and Christians Created a Culture of Tolerance in Medieval Spain. Maria Rosa Menocal. Back Bay Books; Reprint edition. 2003
- The Legacy of Muslim Spain. Salma Khadra Jayyusi (Editor). Brill Academic Publishers; 2nd edition. 2000

• وہ جو تاریک راہوں میں مارے گئے

- The Story of the Moors in Spain. Stanley Lane-Poole, Arthur Gilman. GP Putnam's Sons, London. 1886

آدھی رات کا سورج

زیف سید کی تحریر نے تو مجھے گرفتار کر لیا ہے۔ کیا تکنیک ہے!
کچھ صفحے پڑھ کر بیٹھا ہوں اور اس اشتیاق میں ہوں کہ مجھے یہ
غیر معمولی تحریر ہر حال میں پڑھنی ہے۔

اسد محمد خان

(اس کتاب میں) ماضی و حال یوں بانہوں میں بانہیں ڈال کے
چلتے ہیں کہ درمیان پچھلی صدیاں سمٹ کر محض ایک ورق جتنا فاصلہ
رہ جاتی ہیں جسے الٹ کر ہم اگلے صفحے پر جا پہنچتے ہیں۔

علی محمد فرشی